Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1983

اس پرچہ میں

کیا قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون : ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ ؍؍	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	نومبر ۱۹۸۳ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات (اقبالؒ اور قائد اعظمؒ) ۲

۲۔ باب المراسلات (۱) تھیاکریسی کی حکمرانی (۲) خاتم النبیینؐ ۱۱
(۳) یہ کون سے معاشرہ کے لئے ہے (۴) کلبوں میں کھیلی جانیوالی ریس
(۵) حضرت معاذؓ بن جبل کی حدیث

۳۔ حقائق و عبر ۲۱

۴۔ قرآنی درس کے اعلانات ۲۲

۵۔ نگہ باز گشت (رہگذر طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل (قسط نمبر ۵) مرتبہ محترم محمد اسلام صاحب ۲۴

۶۔ کیا قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے ؟ (محترم پرویز صاحب) ۳۴

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت: ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور۔

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

(حسین یادوں کے اُجلے چراغ)

اس سے پہلے ملک میں علامہ اقبالؒ کے یوم وفات (۲۱- اپریل) کی تقریب منائی جاتی تھی اب کچھ عرصہ سے اسے (نہ معلوم کن وجوہات کی بناء پر) ان کے یوم پیدائش (۹- نومبر) سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہیں کہ وہ تقریب اُن کے یوم پیدائش کی نسبت سے منائی جاتی ہے یا یوم وفات کی نسبت سے۔ ان تقاریب سے مقصد متعلقہ شخصیت کے ان احسانات کی یاد تازہ کرانا ہوتا ہے جن کے زیر بار اس کی قوم ہوتی ہے، اور ہر قوم کیطرف سے اظہارِ تشکر جسے اُس کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبالؒ کے، امت مسلمہ پر بالعموم، اور ملّتِ پاکستانیہ پر بالخصوص احسانات کا تعلق ہے، وہ اس قدر کثیر، دقیع اور گراں بہا ہیں کہ ان کی سپاس گذاری سے کما حقہ، عہدہ برا ہونا مشکل ہے۔ ایک مفکر کے پیغام کی عظمت اور اس کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے قوم کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا، اور کسقدر انقلاب پیدا کیا۔ اس پیمانے سے ماپئے تو، دور دور تک نگاہ دوڑانے سے بھی اقبالؒ کا ہمسر نہیں ملتا۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے مصلحین (ریفارمرز) اور بھی کئی نظر آئیں گے لیکن ان کی نگاہ یا دسترس شجرِ اسلام کی شاخ تراشی تک محدود رہی۔ یہ اقبالؒ تھا جس کی دوررس اور ژرف بین نگاہ اُس کی اصلی و بنیادی تک پہنچی اس نے کہا کہ سوال اس خرابی یا اُس خرابی کا نہیں۔ ہمارا مروجہ اسلام، سرے سے حقیقی اسلام ہے ہی نہیں۔ یہ وہ سکّہ ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کے ٹکسالوں میں ڈھلا اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے خزانہ میں جس کا چلن ہے۔ جب تک اُس اسلام کو حقیقی اسلام سے بدلا نہیں جائے گا، شجرِ ملت کی کوئی شاخ نہ سرسبز و شاداب ہوگی نہ بار آور۔ یہ اسلام، قرآن مجید کے دفتینِ قرآن میں محفوظ (اور اب ملفوف) ہے۔ بنابریں اُس نے ملّتِ اسلامیہ سے کہا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اگر تو مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اُس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تو قرآن کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ آسان کام نہیں۔ اسلام کو مذہبی پیشوائیت

کے چنگل سے چھڑانے کا فریضہ وہی شخص سرانجام دے سکے گا جو، جرأت و بسالتِ فاروقیؓ کے ساتھ اس انقلاب آفریں نعرہ کو لے کر اٹھے کہ۔ حسبنا کتاب اللہ۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

پھر اقبالؒ ان مفکرین میں سے نہیں تھا جن کا نام محض نظریات بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اُس نے یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسے عملاً متشکل کرنے کی کیا صورت ہو گی۔ اس نے (۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں) کہا کہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں مروجہ اسلام مملکتی حیثیت سے پہلے سے رائج نہ ہو۔ وہاں صدرِ اوّل کے سے قرآنی اسلام کو عملاً نافذ کیا جا سکے گا۔

لیکن اقبال با ایں ہمہ بالغ نظری، اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ وہ اپنی حدودِ استطاعت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے جس قسم کی قائدانہ سیاسی اور تنظیمی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی ضرورت ہے یا تو وہ ان کا حامل نہیں اور یا اس کی گری ہوئی صحت اور مضمحل توانائی اس کشمکش کی حریف نہیں ہو سکتی جو اس کے لئے ناگزیر تھی۔ اُس کی نگہ بصیرت ایک ایسی شخصیت کی تلاش میں نکلی جو اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی سکت رکھتا ہو۔

اس مقام پر پہنچ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ اس کی نگہِ تجسس جا کر ٹکی تو کس شخصیت پر ٹکی! اس شخصیت پر جس کی ساری زندگی اقبالؒ کے نظریات اور تصورات کے یکسر خلاف تھی۔ یہ شخصیت تھی مسٹر محمد علی جناحؒ کی جس کا نظریہ نیشنلزم، عقیدہ نیشنلزم اور عمل نیشنلزم تھا۔ وہ (ہندوؤں، مسلمانوں پر مشتمل) متحدہ قومیت کا علمبردار، اور وطنی جمہوریت کا داعی تھا۔ جس کی ساری زندگی اپنی وادیوں کی دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گذری تھی اور جب وہ اپنی تگ و تاز میں ناکام رہ گیا۔ تو بجائے اس کے کہ اپنے نظریات میں تبدیلی کرلے، وہ دل برداشتہ ہو کر وطن سے دور، انگلستان جا بیٹھا اور مستقل طور پر وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اقبالؒ کی نگہِ دور رس نے اس مقصد کے حصول کے لئے جو جناح کے مسلک کے یکسر خلاف تھا، جناح کا انتخاب کیا اور انتخاب کیا تو اس حتم و یقین کے ساتھ کہ انہیں لکھا کہ،

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ (میرے اس تکرار اور اصرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملت کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کشتی کو صحیح و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ (اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام)

ہند و پاک کی تاریخ کا یہ سب سے اہم سوال ہے کہ جناحؒ کو انگلستان سے کون واپس لے کر آیا، اور واپس بھی اس انداز سے کہ اس نے اپنی ساری سابقہ زندگی کی متاع کو رودِ بارِ انگلستان

میں ڈبو دیا اور ایک نیا سفینۂ حیات لے کر واپس آیا۔ اگر سوال صرف روٹھے ہوئے جناحؒ کو منا کر لانے کا ہوتا تو اس کے لئے کوئی کانگریسی لیڈر یا ان کا وفد جاتا۔ لیکن وہ لوگ جناحؒ کے مزاج سے واقف تھے اور اس سے درحقیقت مایوس ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے اس سعی لاحاصل کی جرأت نہیں کی۔ جناحؒ جس طرح اپنے تمام سابقہ نظریات پر خطِ تنسیخ کھینچ کر اور ان سے یکسر متضاد تصورات لے کر لوٹا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ کارنامہ بہرحال کسی عظیم مسلمان شخصیت ہی کا ہو سکتا تھا۔ چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک نہ تو تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی اقبالؒ اور جناحؒ کے قابلِ اعتماد سوانح حیات مدوّن ہوئے ہیں اس لئے اس کا کریڈٹ مختلف لیڈروں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بنیادی نقطہ بالکل واضح ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسٹر جناحؒ نے جو انیشلسٹ) نظریات اختیار کئے تھے اور جن کے مطابق اپنی زندگی بسر کی تھی انہوں نے انہیں کسی کانگریسی لیڈر کی اندھی تقلید کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی عمر بھر کی سوچ بچار کا نتیجہ تھے۔ وہ ان کے حق میں جو دلائل دیتے تھے ان کی اس زمانے کی تقاریر اور بیانات ان سے لبریز ہیں۔ ان نظریات کو ترک کر کے ان کی جگہ ان نظریات کو اختیار کرنا جن کے مطابق انہوں نے تحریکِ پاکستان کی لڑائی لڑی (مذہب کی زبان میں یوں سمجھئے گویا) کفر چھوڑ کر اسلام لانے" کے مرادف تھا۔ ہم پھر کہیں گے کہ جو لوگ جناحؒ کے مزاج سے واقف اور ان کی سیرت سے آشنا ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جناحؒ کو ایسی بنیادی تبدیلی کے لئے سوچنے پر آمادہ کرنا ہی نہیں بلکہ ان میں ایسی تبدیلی پیدا کر دینا کسی عام شخصیت کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا انقلاب کوئی ایسی شخصیت ہی پیدا کر سکتی تھی، جو علمی اور فکری سطح پر بھی جناحؒ سے زیادہ قدآور ہوتی اور جس کے خلوص اور دیانت پر جناحؒ کو کامل اعتماد بھی ہوتا۔ آپ اس دور کی فضا پر گہری نگاہ ڈالئے۔ اقبالؒ کے سوا کوئی شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یہ اقبالؒ ہی تھا جو جناحؒ کے قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ حسنِ اتفاق سے اس کی تائید میں ہمیں ایک شہادت بھی ملتی ہے، اور وہ بھی کسی مسلم لیگی یا پاکستانی کی نہیں) بلکہ ایک غیر مسلم انگریز کی۔ مسٹر ہیکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) نے قائداعظمؒ کی سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام ہی (JINNAH) ہے وہ اس میں لکھتا ہے:-

> مسٹر جناحؒ نے لندن میں، سر محمد اقبالؒ سے بہت سی ملاقاتیں کیں، وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناحؒ اگرچہ (اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق) اب کسی غلط فہمی میں نہیں تھے، تاہم وہ اقبالؒ کے دلائل سے (اتنی جلدی) متفق نہیں ہوئے۔ اس میں قریب دس[1] سال کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناحؒ نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ (صفحہ ۹)

---

[1] ہم سمجھتے ہیں کہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

اس تبدیلیٔ فکر و نظر کے بعد جب مسٹر جناحؒ واپس وطن آئے تو ہیکٹر بولیتھو نے ان کی اس وقت کی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :۔

> مسٹر جناحؒ اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کوئی سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کئے جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود، ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جس سے وہ تسکینِ خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وہ خطوط تھے جو علامہ اقبالؒ نے انہیں، انگلستان میں سنہ ۱۹۳۲ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے۔ اقبالؒ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہندی مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں باقی ماندہ ملک سے الگ کر کے، ان میں آزاد مملکت یا مملکتیں قائم کر دی جائیں۔ کیا آپ کا خیال نہیں کہ اس کے لئے مناسب وقت آ پہنچا ہے؟ (صفحہ ۱۴۱)

آپ سوچیے کہ علامہ اقبالؒ کے خطوط کا وہ بنڈل جس کی طرف بولیتھو نے اشارہ کیا ہے، ملت کے لئے کس قدر متاعِ گراں بہا تھا۔ لیکن وائے برحالِ ما کہ ان خطوط کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ نہ ہی ان خطوط کا جو قائداعظمؒ نے جواب میں لکھے تھے۔ "اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام" کا مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں مئی سنہ ۱۹۳۶ء تا نومبر سنہ ۱۹۳۷ء کے چند خطوط ہیں۔ مسٹر بولیتھو جن خطوط کا ذکر کرتا ہے وہ سنہ ۱۹۳۲ء اور سنہ ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ کے معلوم ہوتے ہیں۔

مسٹر بولیتھو نے جو کچھ لکھا ہے قرائن اس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ اقبالؒ کی جناحؒ کے ساتھ ملاقاتوں اور گمگشتہ / خط و کتابت کا نتیجہ تھا جو جناحؒ کے نظریات میں ایسی انقلابی تبدیلی کا موجب بنے۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ملّتِ پاکستانیہ پر بہت سے احسانات ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ان میں یہ احسان بھی کچھ کم گرانقدر نہیں کہ وہ مسٹر جناحؒ کے نظریات میں اس قدر محیّر العقول تبدیلی پیدا کرنے اور انہیں مراجعت فرمائے وطن ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ سوچیے کہ اگر مسٹر جناحؒ میں یہ تبدیلی نہ آتی اور وہ ان تبدیل شدہ نظریات کے ساتھ واپس نہ لوٹتے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس صورت میں نہ پاکستان وجود میں آتا، نہ ہم آزادی کا خواب تک بھی دیکھ سکتے۔

کیا اقبالؒ کا یہ احسان کچھ کم گراں بہا ہے؟ کیا اس کے بعد ان سے ایسا کہنے میں کچھ بھی مبالغہ ہوگا کہ :

ع۔ زندگی آپ کی نوازش ہے ورنہ ہم کب کے مر گئے ہوتے!

ہم جانیں یا نہ جانیں! اقبالؒ کے اس احسان کو جناحؒ خوب جانتا تھا، اور جناحؒ کے مقام کو اقبالؒ خوب پہچانتا تھا اور اس حقیقت کے شاہد تبریک و تحسین کے وہ تحائف ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کی خبر سن کر قائداعظمؒ نے جو تعزیتی بیان دیا تھا وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا تھا :۔

> مجھے سر محمد اقبالؒ کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ وہ عالمی شہرت کے ایک نہایت

ممتاز شاعر تھے اور ان کی شہرت اور ان کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ملک اور مسلمانوں کی انہوں نے اتنی بہت سی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ عظیم ترین ہندوستانی کے ریکارڈ سے کیا جا سکتا ہے جو کبھی پیدا ہوا ہو۔ حالیہ تک وہ پنجاب کی صوبہ وار مسلم لیگ کے صدر تھے جب کہ ایک غیر متوقع علالت نے انہیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے حامی تھے۔ میرے لئے وہ ایک رہنما تھے۔ دوست اور فلسفی، اور تاریک ترین لمحوں میں جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا۔ وہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف تین دن قبل انہوں نے اس کامل اتحاد کا ذکر پڑھا یا سنا ہوگا جو کلکتہ میں پنجاب کے مسلم قائدین کے مابین ہو گیا اور آج میں فخر و مباہات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ پنجاب پورے طور پر اب لیگ کے ساتھ اور مسلم لیگ کے علَم تلے آ چکے ہیں جو یقیناً سر اقبالؒ کے لئے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس مفارقت میں میری نہایت مخلصانہ اور عمیق ترین ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں۔ اس نازک وقت میں ہندوستان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو ایک مہیب نقصان پہنچا ہے۔" [1]

اس میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قائداعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کو "اپنا راہنما" کہا ہے۔ اس ایک لفظ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ مسٹر جناحؒ میں اس انقلابی تبدیلی کے پیدا کرنے کا ذمہ دار کون تھا جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

یہ کچھ تو قائداعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کے متعلق کہا۔ حضرت علامہ کے دل میں قائداعظمؒ کا کس قدر احترام تھا اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں، سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اس دوست نے علامہؒ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہؒ نے لکھا تھا۔

"میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملت تک مکمل صورت میں پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کی بجائے آپ قائداعظمؒ محمد علی جناح اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے۔"

(نوائے وقت مورخہ ۹ مارچ سنہ ۱۹۷۷ء)

سنہ ۱۹۳۵ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو، علامہ اقبالؒ سے ملنے کے لئے آئے تو میاں افتخار الدین مرحوم نے

[1] سب رس (اقبال نمبر) جون سنہ ۱۹۳۸ء جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۴۷ - بحوالہ کتاب "علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے سیاسی نظریات" از محمد حنیف شاہد ص ۲۹۷

حضرت علامہؒ سے کہا کہ لیگ کی قیادت آپ خود اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لیتے؟ اس پر انہوں نے ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر فرمایا، "میں تو مسٹر جناحؒ کا ایک معمولی سپاہی ہوں"[1] یعنی قائداعظمؒ علامہ اقبالؒ کو اپنا راہنما قرار دیتے ہیں اور علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو قائداعظمؒ کا معمولی سپاہی ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے مختلف تقاریب پر علامہ اقبالؒ کی خدمات کو کن زریں الفاظ میں سراہا تھا، ان کے متعلق طلوعِ اسلام میں وقتاً فوقتاً لکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ موجودہ (۹ نومبر) کی تقریب کا تقاضا ہے کہ ان کی یاد تازہ کی جائے اس لئے ہم ان کے اعادہ میں کوئی بات نہیں سمجھتے۔ عقیدت اور خلوص کے پھول کبھی مرجھایا نہیں کرتے۔ قائداعظمؒ نے دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ (پٹنہ) کے اجلاس میں فرمایا۔

> علامہ اقبالؒ کی وفات مسلمانانِ ہند کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مسلم لیگ ان کی وفات پر پہلے ہی اظہارِ تعزیت کر چکی ہے۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ رہے گا۔ ان کی بلند پایہ شاعری، مسلمانانِ ہند کی تمناؤں اور آرزوؤں کی ترجمان ہے۔ وہ ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں تازہ روح پھونکتی رہے گی۔
>
> (تقاریر محمد علی جناحؒ صہ ۴۷)

انہوں نے سنہ ۱۹۴۰ء میں یومِ اقبالؒ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ کو ان الفاظ میں یاد فرمایا۔

> اقبالؒ میرا پرانا دوست تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتداء میں ایک علمی سی جماعت تھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں اپریل سنہ ۱۹۳۷ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا وہ اقبالؒ تھا۔ میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور اس وقت سے تا دمِ مرگ وہ میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ علامہ اقبالؒ عظیم انسان اور بلاشبہ بہت بڑے فلاسفر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی۔ اقبالؒ کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھے لیکن دنیا میں شاعرِ اعظمؒ کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انہوں نے مسلم سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں علی گڑھ میں ریل کا سفر کر رہا تھا، راستہ میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے کہ دفعتہً ان سب نے اقبالؒ کا یہ ترانہ پڑھنا

---

[1] اقبالؒ کے آخری دو سال، عاشق حسین بٹالوی صہ ۳۳۲۔

شروع کر دیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

شعراء اقوام میں زندگی پیدا کرتے ہیں، ملٹن، شیکسپیئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اقبالؒ نے سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے کہ اسے جب شیکسپیئر اور دولتِ برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ "میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا" گو میرے پاس سلطنت نہیں لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبالؒ کو منتخب کروں گا۔"[1]

قائداعظمؒ نے سنہ ۱۹۴۱ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر میں اس تقریب (یومِ اقبالؒ) میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شریک ہو کر اقبالؒ کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبالؒ کی ادبی شہرت عالمگیر ہے کہ وہ مشرق کے بہت بڑے بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے، مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانہ میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔[2]

اللہ اکبر! علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو قائداعظمؒ کا سپاہی قرار دیتے ہیں اور قائداعظمؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے علامہ اقبالؒ کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے"۔ سچ ہے

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد — بطوفِ شعلہ پروانہ با پروانہ می رقصد

قائداعظمؒ نے سنہ ۱۹۴۴ء میں یومِ اقبالؒ کی تقریب پر علامہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں اس دن جب کہ ہمارے عظیم ملی شاعر اور مفکر اقبالؒ کا یوم منایا جا رہا ہے، خلوصِ قلب سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی روح کو بے پایاں رحمت سے ابدی سکون عطا فرمائے۔

(بحوالہ کتاب: قائداعظمؒ۔ ص ۵۴)

---

[1] "انقلاب" ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

[2] ہفتہ وار حمایتِ اسلام ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

انہوں نے یومِ اقبالؒ کی تقریب (منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۴۴ء) پر حسبِ ذیل پیغام ارزانی فرمایا:۔

اس تقریبِ سعید کے موقعہ پر، جو ہمارے عظیم ملّی، مردِ درویش، حکیم (الامت) اور مفکر کی حسین یاد منانے کے لئے منعقد کی جا رہی ہے، میں مرحوم کی بارگاہ میں قلبی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

وہ اگرچہ آج ہم میں زندہ موجود نہیں لیکن ان کی شاعری، جو یقیناً لافانی ہے، ہماری راہنمائی اور روح پروری کے لئے ہر وقت ہمارے پاس ہے۔ ان کی شاعری، جس کا انداز نہایت حسین اور زبان نہایت شیریں ہے، اس عظیم شاعر کے قلب و دماغ کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے کس قدر سرشار اور اس کے کس حد تک دلدادہ تھے۔ وہ حضورؐ نبی اکرم کے ایک سچے اور پرخلوص متبع تھے ——— وہ اوّل بھی مسلمان تھے اور آخر بھی مسلمان۔ وہ ترجمان الاسلام، بلکہ صوت الاسلام تھے۔

علامہ اقبالؒ ایک نظری مبلغ اور مفکر ہی نہیں تھے۔ وہ جرأت اور عمل، استقامت اور خود اعتمادی کی محکم چٹان تھے۔ اور ان سے بھی بلند، خدا پر غیر متزلزل یقین اور اسلام کے ساتھ بے پناہ عقیدت کے پیکر۔ ان کی ذات میں ایک شاعر کے تخیلات اور ایک ایسے انسان کی حقیقت پژوہی کے خواص مجتمع تھے جو حالات کا عملی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتا ہے عملِ پیہم اور (خدا پر) یقینِ محکم، یہ ہے ان کے پیغام کا خلاصہ۔ اور اس سے وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے (دنیا کے سامنے) نمودار ہوتے ہیں۔ اسلامی اصولوں (کی فکمیت) پر انہیں غیر متزلزل یقین تھا۔ کامیابی سے ان کی مراد، تعمیرِ خودی تھی۔ اور ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ، اسلامی تعلیمات کا اتباع ——— تعمیرِ خودی اور عملِ پیہم، نوعِ انسان کے نام ان کا پیغام تھا۔

وہ اگرچہ ایک عظیم شاعر تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی سیاستدان بھی تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بناء پر ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے۔ یہ علاقے مسلمانوں کے تاریخی اماکن بھی ہیں۔

میں اقبالؒ ڈے کی اس تقریب میں عمیق قلب سے شریک ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنے اس ملّی شاعر کے پیش کردہ نظریات پر عمل پیرا ہوں تاکہ جب مملکتِ پاکستان متشکل ہو تو ہم ان نظریات کو عملی قالب میں ڈھال سکیں۔

علامہ اقبالؒ کے "خطوط بنام جناح" کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا اس کا پیش لفظ خود قائدِ اعظمؒ نے تحریر فرمایا تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے اُن مراحل کا ذکر کیا جن سے تحریک مسلم لیگ گذری تھی۔ اس کے بعد کہا:۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کے بعد ان خطوط کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ مگر اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے اقبالؒ کو جو جوابات دیئے تھے وہ مہیا نہیں ہیں۔ زیرِ نظر زمانہ میں میں بالکل

تنِ تنہا کام کرتا تھا اور مجھے ذاتی سٹاف کی مدد تک میسّر نہ تھی۔ اس لئے مجھے جس قدر خطوط کے جوابات دینے پڑتے تھے ان کی نقول بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا۔ لاہور میں بیگ نے اقبالؒ ٹرسٹ کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے جوابات اُدھر بھی دستیاب نہیں۔ لہٰذا میرے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہ گئی تھی کہ ان خطوط کو بغیر اپنے جوابات کے ہی شائع کر دوں کیونکہ ان کی تاریخی اہمیت بہت بڑی ہے۔ بالخصوص وہ خطوط جن میں انہوں نے بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے سلسلے میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے ان کے گہرے مطالعے اور غور و خوض کے بعد آخراً میں بھی ان ہی نتائج تک پہنچا جو سر اقبالؒ کے تھے۔ یہی تصوراتؒ تھے جو اپنے وقت پر آکر مسلمانانِ ہند کے متفقہ ارادے کی شکل میں نمودار ہوئے اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد کی صورت اختیار کر گئے جسے عام طور پر قراردادِ پاکستان کہا جاتا ہے اور جو ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور کی گئی تھی۔

یہ تھے اقبالؒ اور یہ تھے جناحؒ ——— خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

اور یہ تھے ان کے احسانات اِس احسان فراموش قوم پر!

"نگہ بازگشت کا صفحہ ۳۲ کا بقیہ

کو چھوڑ دیا تھا۔ فریاد یہ ہوگی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ اس مؤاخذہ سے بچنے کے لئے ایک ہی صورت ہے کہ جس حکومت، قانون یا شریعت کو آپ "اسلامی" کہتے ہیں اس کے اسلامی ہونے کی قرآنی سند آپ کے پاس ہو۔ اس کے لئے کسی امام، کسی محدث، کسی فقیہ، کسی مفسّر، کسی عالم، کسی نظریاتی کونسل، کسی مجلسِ شوریٰ کا قول یا فیصلہ بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول سند قرار نہیں پائے گا۔ خدا کے حضور سند صرف خدا کی کتاب ہوگی۔ یہ ہے طلوعِ اسلام کا پیغام اور انتباہ!

اسلامی معاشرت

پرویز صاحب کی اس عام فہم کتاب میں زندگی کے روزمرہ کے امور کے متعلق قرآنی احکام ایسے سلیس اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں کہ اس سے بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بڑی آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے یکے بعد دیگرے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت -/۶ روپے علاوہ محصول ڈاک

باب المراسلات

تھیاکریسی کی حکمرانی :

۱۔ سوال :۔ آپ مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ نظامِ تھیاکریسی سیاسی نظام سے کہیں زیادہ ہمہ گیر متشدد اور پائندہ تر ہوتا ہے۔ اس کی ذرا وضاحت فرما دیجئے۔

جواب :۔ یہ حقیقت بڑی واضح ہے۔ (مثلاً) عباسی مملکت باقی نہ رہی۔ ان کی حکومت نسیاً منسیا ہو گئی۔ وہ سلاطین نذرِ خاک ہو گئے۔ جو سیاسی قوانین و ضوابط انہوں نے وضع اور نافذ کئے تھے وہ سب کالعدم ہو گئے۔ ان کے اثار تک مٹ گئے۔ لیکن اس دور میں جو قوانین شریعت کے نام سے مدوّن ہوئے تھے، ان کی حکمرانی بدستور قائم ہے، وہ امّت کے سر پر اسی طرح مسلط ہیں۔ یہ وہ شخصی قوانین (پرسنل لاز) ہیں جو فقہ کے نام سے امّت میں رائج ہیں۔ اس تمام دوران میں مملکتیں قائم ہوئیں اور اجڑ گئیں۔ حکومتیں بنی اور بگڑیں۔ فلک جاہ تزوتوں، قوتوں، دبدبوں، کے مالک شہنشاہ اپنے اپنے وقت میں زلزلہ انگیز ہونے اور پھر اسودۂ لحد ہو گئے۔ ان گردشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۴۰) کے مناظر زمانہ کے پردۂ سیمیں پر سامنے آتے اور تاریخ کے اوراق میں سمٹتے چلے گئے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی قلمرو میں نہ زوال آیا، نہ تغیر۔ ان کے وضع کردہ قوانین کی محکمیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی جزئیات تک کو کوئی چھو نہیں سکتا۔ وہ تقدّس کے حصار میں محفوظ ہیں۔ وہ خدا کی کبریائی کی طرح ابدی تصوّر کئے جاتے ہیں۔ اور ارشاداتِ الٰہیہ کی طرح غیر متبدل۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا تصوّر الحاد ہے اور ان سے انحراف، ارتداد جس کی سزا موت ہے۔ غیر اسلامی حکومت میں تو پھر بھی ان کا دائرہ پرسنل لاز تک محدود رہتا ہے لیکن "اسلامی حکومت" میں ان کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ معاشرتی، معاشی، سیاسی (وغیرہ) امور سے متعلق کسی باب میں بھی جب اربابِ مذہب کہیں کہ "شریعت کا یہ حکم ہے" تو بڑے سے بڑے ذی اقتدار کی بھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس کے خلاف ایک حرف بھی زبان تک لا سکے۔ دنیاوی اربابِ اقتدار تو ایک طرف، اگر خدا کا کوئی حکم بھی ان کے خلاف ہو، تو مذہبی پیشوائیت کا فیصلہ ہو گا

کو اسے منسوخ سمجھا جائے۔ اربابِ حکومت کس طرح ان کے دست نگر اور تابع فرمان ہوتے ہیں، اس کی تازہ ترین مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ موجودہ حکومت کو مطلق اختیارات حاصل ہیں۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہے جس کے فیصلوں کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ عدالتیں بھی نہیں۔ اس کے تحت، حکومت آرڈیننسز نافذ کرتی رہتی ہے جنہیں ہر طرح کی بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہی حکومت جب کوئی قانون، اسلام یا شریعت کے نام سے نافذ کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کے لئے مذہبی پیشوائیت کی تائید یا توثیق حاصل ہو۔ اس باب میں، اختیارات مطلق کی حامل حکومت بھی کسقدر مجبور ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تعزیرات سے متعلق جو حدود آرڈیننسز" جاری ہوئے ہیں، خود صدر مملکت (یا یوں کہیئے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر) متعدد بار فرما چکے ہیں کہ وہ ناقابل العمل ہیں۔ ان کے تحت کسی مجرم کو سزا نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے باوجود ان قوانین کو چھیڑا تک نہیں جا سکتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دیا کہ رجم (سنگساری) کی سزا خلاف اسلام ہے۔ صدر ضیاء الحق اس سے متفق نہیں تھے۔ ۱۹۷۹ء کے آرڈی ننس کی رُو سے وہ رجم کو اسلامی قرار دے چکے تھے۔ اسی طرح وہ اپنے مطلق اختیارات کی رُو سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے وفاقی شرعی عدالت میں تبدیلی کی اور اس سے کہا کہ وہ سابقہ عدالت کے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرے۔ اس عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ رجم کی سزا اسلام کے مطابق ہے۔

عدالت کا یہ فیصلہ (ہمارے آپ کے نزدیک) کیسا ہی خلافِ قرآن کیوں نہ ہو، اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ ایسا کرنا تو بینِ عدالت قرار پا جائے گا جو قانون کی رُو سے جرم ہے۔ اگر یہ فیصلہ کسی عام عدالت کا ہوتا تو کل کو اگر وہ عدالت باقی نہ رہتی تو اس فیصلہ کو چیلنج بھی کیا جا سکتا تھا، اور منسوخ بھی قرار دیا جا سکتا۔ سابقہ عدالتوں کے کتنے فیصلے ہیں جنہیں آج کل کالعدم قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ "شرعی عدالت" کا ہے اور اس نے قانون مملکت کی ہی نہیں شرعی یا اسلامی قانون کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کل کو یہ عدالت نہ رہے۔ بلکہ موجودہ حکومت بھی نہ رہے، حتیٰ کہ یہ مملکت بھی نہ رہے، تو بھی آپ اس قانون کے خلاف لب کشائی نہیں کر سکیں گے کیونکہ ایسی صورت میں، مذہبی پیشوائیت دہائی مچا دے گی کہ یہ اسلام کی مخالفت ہے۔ یہ الحاد ہے بددینی ہے۔ حتیٰ کہ ارتداد ہے۔ واضح رہے کہ جو تین علماء، اس نئی شرعی عدالت میں شامل کئے گئے تھے ان کا پہلے ہی یہ عقیدہ تھا کہ رجم کی سزا اسلامی ہے۔ لیکن اس وقت ان کا یہ عقیدہ محض فتویٰ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب وہ قانون شریعت بن گیا ہے۔ اب یہ فیصلہ سابقہ فقہی قوانین کے ضابطہ میں شامل ہو جائے گا اور ابدی طور پر غیر متبدل قرار پا جائے گا۔ جو فقہی قوانین ہمارے ہاں (یعنی امت مسلمہ میں) رائج چلے آ رہے ہیں، وہ اسی طرح مرتب ہوئے تھے۔ ان کے مرتبین کی علمی اور فقہی قابلیت مسلّم

ان کا بزرگانہ احترام بھی اپنے مقام پر بجا، لیکن وہ تھے تو بالآخر انسان ہی۔ لیکن عقیدت مندانہ غلو نے انہیں فوق البشر مقام عطا کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے مرتب کردہ کسی قانون پر "تنقید" کو ان کی توہین قرار دے دیا جاتا ہے اور ایسا جرم جس کی پاداش میں اس شخص پر جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔

رجم سے متعلق موجودہ فیصلہ نے ایک اور حقیقت کو بھی منکشف کیا ہے۔ یہ فیصلہ کہ رجم خلافِ اسلام ہے، بھی ایک شرعی عدالت کا تھا، اور یہ فیصلہ کہ رجم مطابقِ اسلام ہے، بھی ایک اسی پایہ کی شرعی عدالت کا ہے اور دونوں فیصلوں کے متعلق "متعلقہ عدالتوں کا بہرحال دعویٰ یہ ہے کہ ان کے فیصلے کتاب وسنت" کے مطابق ہیں۔ دونوں فیصلے (جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں) تاریخ میں محفوظ ہو کر آنے والی امت کے ہاں پہنچ جائیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ پہلی عدالت کے فیصلہ کو کتاب وسنت کے مطابق (فلہٰذا صحیح اسلامی) قرار دیں گے اور کچھ لوگ دوسری عدالت کے فیصلے کو۔ اس طرح دو فرقے وجود میں آ جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ فرقے اسی طرح وجود میں آئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے فقہی قوانین کتاب وسنت پر مبنی ہیں۔ ان دونوں (نئے فرقوں) کے آپس میں تو مناظرے اور مباحثے ہوں گے لیکن کوئی شخص ان میں سے کسی ایک فیصلہ پر بھی تنقید کر دے گا تو یہ دونوں اس کے خلاف یہ کہہ کر متحدہ محاذ بنا لیں گے کہ یہ شخص اسلام میں قانون سازی کے اصول کی مخالفت کرتا ہے۔ ان کی اس مخالفت میں کوئی حکومت بھی اس نادان کا ساتھ نہیں دے گی۔ اگر کوئی حکومت ایسا کرنے کی جرأت (بالفاظ صحیح حماقت) کر بیٹھیگی تو بھڑوں کا چھتہ اس کا ایسا تعاقب کرے گا کہ اسے کسی جوہڑ میں ڈوب جانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آئے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی (تھیاکریسی) کی وسعتیں، زمان و مکان، ہر دو جہت سے کس قدر لامحدود ہیں۔ کیا دنیا کی کسی اور حکومت کو اس قسم کے اختیارات حاصل ہیں؟ ان کی حکومت کی ایک منفرد خصوصیت اور بھی ہے۔ انہیں اپنی حکمرانی کے تحفظ کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ فوج کی۔ نہ انتظامیہ کی حاجت ہوتی ہے، نہ اقتصادیہ کی۔ یہ تمام دردِسر گورنمنٹ کا ہوتا ہے اور حکم ان کا چلتا ہے۔ یعنی گائے کے سینگ کسی اور نے پکڑے ہوتے ہیں اور دودھ یہ دوہتے ہیں۔ لوگ ان کی فرمانبرداری بھی کرتے ہیں، نذرانے بھی پیش کرتے ہیں، اور پاؤں بھی چومتے ہیں۔ انہیں اپنے سنگھاسن کے ڈولنے کا خطرہ ہی نہیں ہوتا حکومتیں آتی رہیں، جاتی رہیں، ان کا سکہ ہر عہد میں رواں رہتا ہے۔ یہ بہت سمجھ دار لوگ ہیں۔ یہ دوسروں کو تخت پر بٹھاتے ہیں، خود کبھی تخت پر نہیں بیٹھتے۔ اس لئے تخت پر بیٹھنے کی کوئی ذمہ داری اپنے سر پر نہیں لیتے۔ برہمن راجہ کے ماتھے پر تلک لگاتا اور اسے آشیرباد (دعا) دے کر مندر میں چلا جاتا ہے۔ پادری بادشاہ کے سر پر مقدس پانی چھڑک کر اور اسے "محافظِ مذہب"

قرار دے کر بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ قاضی القضاۃ، خلیفۃ المسلمین کے ظل اللہ علی الارض (زمین پہ خدا کا سایہ) ہونے کا اعلان کر کے، فتاویٰ کا قلمدان سنبھال لیتا ہے۔ ہر قسم کی مخالفتوں کا مقابلہ صاحبانِ تخت و تاج کو کرنا پڑتا ہے، اور حکم ان کا چلتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے احکام اور فتاویٰ کے نفاذ کی ذمہ داری بھی اربابِ حکومت کے سر پہ ہوتی ہے۔ مذہب پرست حکومتوں کا تو ذکر ہی کیا، سیکولر حکومتیں بھی مذہبی پیشوائیت کے حدودِ قلمرو میں دخل انداز نہیں ہو سکتیں۔

یہ ہے تھیا کریسی کی حکمرانی کی کیفیت! سوچئے کہ کوئی بھی اس قسم کی حکمرانی کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوگا؟ اسے چھڑایا تھا صدرِ اول (محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی قرآنی حکومت نے جس نے ان تمام امور کو، جنہیں مذہبی پیشوائیت نے اپنی اجارہ داری بنا رکھا تھا اپنے ہاتھ میں لے کر اس طبقہ کا وجود ختم کر دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ مذہب اور سیاست کی ثنویت کو کس طرح مٹایا جاتا ہے۔ یہ تاریخِ انسانیت کا منفرد انقلاب تھا۔ دنیا کی کسی قوم نے نہ اس سے پہلے ایسا کیا تھا اور نہ اس کے بعد کوئی قوم ایسا کر سکی ہے۔ ایسا صرف اسلام نے کر کے دکھایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس ثنویت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ "مذہبی امور" بھی حکومت کی تحویل میں رہیں۔ اس کا طریقہ یہ نہیں کہ امورِ مملکت بھی مذہبی پیشوائیت کے تابع فرمان ہوں۔

لیکن اسلام نے جو کچھ مذہبی پیشوائیت کے ساتھ کیا تھا، مذہبی پیشوائیت نے اس سے اسکا ایسا انتقام لیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے اس اسلام ہی کو ختم کر دیا جس نے ان کے اقتدار کو ختم کیا تھا۔ اور اس کے بعد شجرِ ملت پہ اس طرح آکاس بیل بنکر چھا گئی کہ درخت سوکھتا گیا اور بیل پھیلتی چلی گئی۔ آج دنیا کی کسی قوم میں بھی مذہبی پیشوائیت کا اس قدر محکم تسلط نہیں جتنا مسلمانوں کے ہاں ہے۔ ہمارے زمانے میں دنیا کی اکثر قوموں نے ان کے تسلط کو کمزور کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں یہ پہلے سے بھی زیادہ متشدد ہو گیا ہے۔ اور ایسا بڑے ہی نگاہ فریب انداز سے کیا گیا ہے۔ اس کا نام رکھا گیا ہے "احیاءِ اسلام" (فنڈامینٹلزم) یاد رکھئے! مروجہ اسلام کے احیاء اور فروغ کی کوششیں جسقدر بار آور ہوں گی اسی قدر مذہبی پیشوائیت کی گرفت مضبوط ہوتی جائیگی۔ اور اسی نسبت سے اُمتِ مرحومہ کا جسدِ ناتواں کمزور اور مضمحل ہوتا جائے گا۔

اس کا توڑ قرآن کے عصائے ازلی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی طرف، یہ سازشیں اسے آنے نہیں دیں گی۔ اگر آپ اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو فرصت میں "ارمغانِ حجاز" میں۔ اقبالؒ کی بصیرت افروز نظم، "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا مطالعہ کیجئے۔ اور بار بار کیجئے۔ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات۔

———— ☆ ————

۲۔ خاتم النبیین

سوال: طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۸۳ء میں "مقدمہ بہاول پور" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے عجیب حقائق سامنے آئے ہیں اوّل یہ کہ ۱۹۳۵ء میں ایک عدالت نے یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ "احمدی" دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اس کے بعد اس مسئلہ میں بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ حیرت ہے کہ اس تمام دوران میں ہمارے علماء ختم نبوت کے موضوع پر مرزائی صاحبان سے بحثیں اور مذاکرے کیوں کرتے رہے؟ انہیں صاف کہہ دینا چاہیئے تھا کہ اگر آپ کو عدالت کے فیصلہ سے اختلاف ہے تو اس کے خلاف اعلیٰ عدالت میں اپیل دائر کریں، اس فیصلہ کو منسوخ کرا لیجئے۔ جہاں تک معلوم ہے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا اس فیصلہ کی رُو سے یہ خود بخود خارج از اسلام قرار پا جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ عدالت نے یہ فیصلہ پرویز صاحب کے ایک مضمون کی بنیاد پر صادر کیا تھا جس میں انہوں نے مقامِ نبوت کی وضاحت کی تھی۔ حیرت ہے کہ جس شخص کا نبوت کے متعلق ایسا عقیدہ ہو۔ اسے ہمارے مولوی صاحبان "منکرِ نبوت" قرار دیتے ہیں۔ بعض حضرات نے تو انہیں "قادیانیوں" کے زمرے میں شمار کر دیا تھا؛ الزام تراشی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے!

ایک بات البتہ وضاحت طلب ہے۔ ہمارے ہاں رسول اللہؐ کو خاتم النبیین کہہ کر پکارا جاتا ہے (قرآن کریم میں ایسا ہی آیا ہے) مرزائی کہتے ہیں کہ ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے اور ہم بھی رسول اللہؐ کو خاتم النبیین مانتے ہیں، اس کی وضاحت ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

طلوعِ اسلام:-

بے شک یہ بات بڑی اہم ہے کہ ۱۹۳۵ء میں پرویز صاحب کے ایک مضمون کی بنا پر عدالت نے "احمدیوں" کو خارج از اسلام قرار دیا تھا۔ لیکن پرویز صاحب کی تو ساری عمر ان لوگوں کے خلاف جہاد میں گذری ہے، تا آنکہ حکومتِ پاکستان نے انہیں (ستمبر ۱۹۷۴ء میں) قانوناً غیر مسلم قرار دیدیا۔ "خاتم النبیین" کی اصطلاح سے پیدا کردہ جس الجھاؤ کی طرف، مستفسر نے اشارہ کیا ہے، طلوعِ اسلام نے اسے اسی زمانے میں بھانپ لیا تھا جب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا سوال زیرِ بحث تھا۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۴ء میں لکھا تھا:-

> اس قسم کا الجھاؤ یہ حضرات "خاتم النبیین" کی اصطلاح کے سلسلہ میں پیدا کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ لوگ بڑے دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرمؐ کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ مرزا صاحب کے خلیفۂ اوّل حکیم نورالدین کے نہ ماننے میں خود قادیانیوں میں سے بعض نے یہ سوال اٹھایا کہ ایک طرف ہم مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور دوسری طرف

ہم سے کہا جاتا ہے کہ تم ہر جگہ اقرار و اعلان کرو کہ ہم نبی کریمؐ کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ تو اس تقاضے کے معنی کیا ہیں۔ اس پر حکیم صاحب نے فرمایا کہ جب مسلمان حضورؐ کو خاتم النبیین کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد ہوتی ہے۔ وہ ذات جس پر نبوت ختم ہو گئی۔ لیکن جب ہم آپ کو خاتم النبیین کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے وہ رسول جس کی مہر سے مرزا صاحب نبی بنے ہیں۔ اس لئے تم اس اصطلاح کو کھلے بندوں استعمال کرو اور اس کا عام چرچا کرو۔ اس کے مفہوم کی بحث نہ چھیڑو۔ (ص ۷)

خود حکیم صاحب کے الفاظ ہیں:-

رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں خاتم النبیین فرمایا، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہمارا یہ مذہب ہے کہ اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم نہ کرے تو بالاتفاق وہ کافر ہے۔ یہ جدا امر ہے کہ ہم اس کے کیا معنی کرتے ہیں اور ہمارے مخالف کیا۔ (ختم نبوت اور تحریک احمدیت ص ۶۲-۱۶۳)

ایک شخص کے سوال کے جواب میں انہوں نے اس کی وضاحت اس طرح کی:

خاتم مہر کو کہتے ہیں۔ جب نبی کریمؐ مہر ہوئے۔ اگر ان کی امت میں کسی قسم کا نبی نہیں ہو گا تو وہ مہر کس پر ہوئے یا مہر کس پر لگی۔ (ایضاً ص ۹۹)

بنا بریں ہم نے کہا تھا کہ جس قانون میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے اس میں یہ نہ لکھا جائے کہ جو شخص رسول اللہؐ کو خاتم النبیین نہیں مانتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس سے احمدی حضرات ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور کہیں گے کہ ہم رسول اللہؐ کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بجائے کہنا یہ چاہیئے کہ جو شخص دعویٰ نبوت کرے (خواہ وہ اس لفظ کے معنی کچھ ہی لے) وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور جو اسے مسلمان تسلیم کرے وہ بھی خارج از اسلام ہے۔

خاتم النبیین کی اصطلاح کے متعلق پرویز صاحب نے اپنی کتاب ختم نبوت اور تحریک احمدیت میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ کتاب مرزائیت کے موضوع پر قولِ فیصل قرار دی جا سکتی ہے۔ جو التباس احمدی حضرات پیدا کرتے تھے۔ اس کے ازالہ کے لئے پرویز صاحب نے کہا تھا کہ نبی اکرمؐ کو سیدھے سادھے الفاظ میں "آخری نبی" کہنا چاہیئے۔ جو شخص حضورؐ کو خاتم النبیین کہے گا اس کے متعلق احمدی یہ مغالطہ پیدا کر سکیں گے کہ وہ احمدی ہے۔ اگر وہ احمدی نہیں تو وہ کہاں کہاں اپنی صفائی پیش کرتا پھرے گا کہ اس سے اس کی مراد "آخری نبی" ہے "نبیوں کی مہر" نہیں۔ احمدیوں کو اس قسم کی مغالطہ آفرینی کا موقعہ بہم پہنچانے سے بچنا چاہیئے۔ اس سے کوئی شخص اپنی "احمدیت" کو اس اصطلاح کے نقاب میں چھپا نہیں سکے گا۔

یہ کون سے معاشرہ کیلئے ہیں

ایک اہم سوال

طلوعِ اسلام مسلسل لکھتا رہتا ہے کہ اسلامی نظام اس طرح کا ہوگا۔ اسلام کے معاشی نظام کی کیفیت یہ ہوگی۔ اس میں کسی کے پاس فالتو دولت نہیں ہوگی۔ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوگی۔ مزارعت، مضاربت، بینک منافع سب کا شمار ربوٰ میں ہوگا۔ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا ذمہ ہوگا۔ اس میں معاشرہ جرائم سے پاک ہوگا۔

احترامِ آدمیت معاشرہ کا بنیادی اصول ہوگا۔ عورت کو تمام انسانی حقوق یکساں حاصل ہونگے وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ آپ یہ سب کچھ کس کے لئے لکھتے ہیں؟ ایسا کب ہوگا؟ کس معاشرہ میں ہوگا؟ موجودہ معاشرہ میں نہ تو کوئی اس قسم کی باتوں کو سنتا ہے، نہ ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ پھر اس وعظ کا فائدہ کیا ہے؟

طلوعِ اسلام مستفسر نے جس دلسوزی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ہم اس کی قدر کرتے ہیں اور ان کی اطلاع کے لئے عرض کرتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت کے ضمن میں کہتے ہیں۔ اسلامی حکومت وہ ہوگی جو قرآن کے مطابق قائم ہوگی اور جس کا سارا کاروبار قرآن کی حدود کے اندر سرانجام پائے گا۔ اس کا معاشرتی، سیاسی، معاشی، غرضیکہ ہر نظام قرآن کے مطابق ہوگا۔ یہی مملکت (یا حکومت)، خلفائے راشدینؓ کی طرح جانشینِ حضور رسالتمآبؐ کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اسی کی سنٹرل اتھارٹی کو ہم "مرکزِ ملت" کہہ کر پکارتے ہیں جو قرآنی احکام نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔ اسے "مرکزِ ملت" اس لئے کہتے ہیں کہ جس طرح دائرے کے محیط کا ہر نقطہ مرکز (CENTER) سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے، اسی طرح یہ حکومت بھی ملت کے ہر فرد سے یکساں فاصلے پر ہوگی ——— نہ کسی کے قریب، نہ کسی سے بعید، نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی، نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اسے قرآن کریم کی اصطلاح "امۃ وسطا" (۲/۱۴۳) کا مفہوم سمجھئے۔ عصرِ حاضرہ کے سیاسی نظام نے بھی سنٹرل گورنمنٹ کی اصطلاح کا انتخاب کیا، لیکن کہاں طاغوتی نظام کا سنٹر، اور کہاں قرآنی نظام کا سنٹر! بہرحال ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ اس مملکت یا نظام کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ فضا میں نہ کوئی انہیں دل کے کانوں سے سنتا ہے (اِلّا ماشاء اللہ) نہ ان پر عمل کیا جاتا ہے لیکن بایں ہمہ، ہم لکھتے ہیں اور جب تک تو فیقِ ایزدی شاملِ حال رہی، لکھتے رہیں گے۔ اوّل تو اس لئے کہ جو کچھ موجودہ فضا میں ہو رہا ہے، بصارت کے ساتھ بصیرت رکھنے والی نگاہیں دیکھ سکیں کہ وہ کس قدر قرآن کے مطابق ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ جب اور جہاں کہیں

قرآنی مملکت قائم ہوتی ہے (MATERIAL) اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے سلسلہ میں اس کے لئے ممد و معاون ثابت ہوگا۔ یہ اسی ارشادِ خداوندی کے مطابق ہے جس کی رو سے قرآن کریم کے متعلق کہا گیا تھا لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (۶/۱۹) یہ حضورؐ کی مخاطب قوم کے لئے بھی تنذیر ہے اور ان کے لئے بھی جن تک یہ ان کے بعد پہنچے۔ اور چونکہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ہمارے پیشِ نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں، اس لئے ہم اس سے متاثر ہی نہیں ہوتے کہ کوئی ہماری بات سنتا ہے یا نہیں!

ہمیں ہے حکم اذاں، لا الٰہ الا اللہ

اس کے بعد اس سوال کا اگلا (اور اہم) حصہ سامنے آتا ہے کہ "ان حالات میں وہ لوگ کیا کریں جو اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں"۔ قرآن کریم کی رُو سے تو ایسے حالات میں ہجرت لازم آجاتی ہے۔ لیکن ہجرت اس مقام کی طرف کی جاتی ہے جہاں قرآنی نظام قائم ہو، یا اس کے قیام کے لئے فضا سازگار ہو۔ اس وقت دنیا میں کوئی بھی خطۂ زمین ایسا نہیں لہٰذا ہجرت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جہاں تک امکان میں ہو، قرآن کے انفرادی احکام پر عمل کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس فکر کو عام کیا جائے کہ قرآنی اسلام کیا ہے اور قرآنی نظام کی خصوصیات کیا ہوں گی، "تاکہ امت اس مغالطہ سے نکل سکے کہ مروّجہ اسلام، حقیقی اسلام ہے۔ نبی اکرمؐ کے بعد بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵/۶۷) کے فریضہ کی ادائیگی کی یہی ممکن العمل صورت ہوگی۔ طلوعِ اسلام اسی پر کاربند ہے۔

۴۔ کلبوں میں کھیلی جانے والی ریس:

سوال:۔ ہمارے ہاں عام طور پر کلبوں میں، تاش کے پتوں کے ذریعے ریس کھیلی جاتی ہے، جس میں ہار جیت بھی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب:۔ قرآن کریم نے "خمر اور میسرہ" کو شیطانی اعمال قرار دیا ہے اور ان سے بڑی سختی سے روکا ہے۔ (۵/۹۱) عام طور پر خمر کے معنی شراب کے لئے جاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اس کے معنی اس سے وسیع تر ہیں۔ اس کے معنی ہیں ہر وہ شے جو عقل پر پردہ ڈال دے؛ اسے ماؤف کر دے۔ شراب بھی اس کے اندر آجاتی ہے (بلکہ ہمارے نزدیک تو اشیاء مستعملہ کے علاوہ، ہر وہ عقیدہ بھی خمر کے زمرہ میں آسکتا ہے جو عقل کے استعمال کو ممنوع قرار دے)۔ جہاں تک میسرہ کا تعلق ہے، اس کے عام معنی جوا۔ کئے جاتے ہیں، لیکن بنیادی طور پر اس کے معنی ہر وہ دولت ہے جو بلا محنت ہاتھ آجائے۔ اسی مادہ سے "ایسنار" ہے جس کے معنی "بایاں ہاتھ" ہیں۔ ہمارے ہاں محاورہ ہے ——— "یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔ اس سے میسرہ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے یعنی (EASY MONEY)۔ انگریزی زبان میں اسے (GAMES OF CHANCE) کہا جاتا ہے جو پیسہ (BY CHANCE)

حاصل ہو جائے اس میں خمر اور میسرہ دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ خمر کا اس لئے کہ اس (CHANCE) میں عقل و خرد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور میسرہ اس لئے کہ وہ پیسہ بلا محنت و مشقت حاصل ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم نے خمر اور میسرہ کے نتیجہ کو اثم سے تعبیر کیا ہے (۲/۲۱۹) اثم کے معنی ہوتے ہیں، انسانی قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو جانا۔ جو پیسہ بھی محنت اور مشقت کے بغیر حاصل ہو جائے اس سے انسان کی اکتسابی قوتوں کا مضمحل ہو جانا لازمی امر ہے۔

بہر حال، جؤا خواہ بیٹھکوں میں کوڑیوں اور پانسوں سے کھیلا جائے، اور خواہ کلبوں میں تاش کے پتوں سے۔ وہ میسرہ ہے اور عمل الشیطان لیکن ہمارے ہاں عجیب ستم ظریفی ہے۔ یہاں بیٹھکوں میں کھیلا جانے والا جؤا، جرم بھی ہے اور جہالت کی علامت بھی، اور کلبوں میں کھیلے جانے والا جؤا محض تفریح ہے اور مہذب ہونے کی نشانی۔ چنانچہ بیٹھکوں پر چھاپے مارنے والے، آپ کو اکثر رات کو کلب میں ملیں گے، غیر مہذب جواریہ، ہر ایک کی نظروں میں قابل نفرت اور مہذب جواریہ معاشرہ میں عزت و اکرام کا مستحق ——— جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

———— ✽ ————

۵۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث:

سوال:۔ آج کل حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک حدیث کا بڑا چرچا کیا جاتا ہے جو اسطرح ہے کہ جب نبی اکرمؐ نے (حضرت معاذ کو) یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا کہ آپ وہاں نظام حکومت چلانے کے لئے فیصلے کس طرح کریں گے۔ انہوں نے کہا "میں کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلے کروں گا۔" آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس کے متعلق کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملا، تو؟ انہوں نے کہا "پھر میں حضورؐ کی سنّت کی طرف رجوع کروں گا۔" آپ نے پھر سوال کیا کہ "اگر آپ کو سنّت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو پھر کیا کریں گے؟" حضرت معاذؓ نے کہا کہ پھر میں ان دونوں کو سامنے رکھ کر اجتہاد کروں گا۔

اس حدیث سے ایک گروہ سنّت کو قانون کا ماخذ قرار دینے کے حق میں دلیل لاتا ہے۔ دوسرا گروہ اجتہاد کو۔ آپ کا اس حدیث کے متعلق کیا خیال ہے، اور اجتہاد کا حق کس کو حاصل ہے؟ اور اس کی شرائط کیا ہیں؟

جواب:۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس روایت پر تنقید کی گئی ہے اور سند کے اعتبار سے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن درایت کی رو سے دیکھا جائے تو یہ واضح طور پر وضعی نظر آئے گی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ ایک باضابطہ، منظم حکومت کی طرف سے گورنر بن کر یمن جا رہے تھے۔ اگر کسی نے آپؓ سے اس قسم کا سوال کیا ہوگا کہ آپ فیصلے کسطرح کریں گے

تو (ظاہر ہے کہ) انہوں نے یہ جواب دیا ہوگا کہ پیشِ نظر معاملہ کے متعلق میں دیکھوں گا کہ حکومت کی طرف سے کوئی فیصلہ یا ہدایت موجود ہے۔ اگر موجود ہوگی تو میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو میں حکومت سے دریافت کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے!

اگر گورنر یہ مسلک اختیار کر لیں جسے (روایت میں) حضرت معاذؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، تو مختلف صوبوں میں مختلف احکام نافذ ہوں اور مملکت میں انارکی پھیل جائے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت اس زمانے میں وضع ہوئی تھی جب مرکزی حکومت کا اقتدار ختم ہو چکا یا کمزور پڑ چکا تھا اور صوبوں کے گورنر خود مختار بن چکے تھے، یا بننا چاہتے تھے۔ اور اس کے حق میں "شرعی جواز" چاہتے تھے۔ روایات اسی طرح وضع ہوا کرتی تھیں۔

باقی رہا اجتہاد، سو اس کا حق کسی فرد کسی فرقہ یا کسی گروہ کو بھی حاصل نہیں۔ اسلامی حکومت متعلقہ امور کے متعلق غور و فکر کے بعد فیصلے کرے گی جن کی اطاعت سب پر لازم ہو گی۔ انفرادی اجتہاد کا تصور اس وقت پیدا ہوا (یا اس کی ضرورت اس وقت پیش آئی) جب اسلامی حکومت باقی نہ رہی اور دین مذہب میں بدل گیا۔ پھر اس کے استحقاق کے متعلق بھی بحثیں چھڑیں اور شرائط کے متعلق بھی۔ اسلامی حکومت میں اس قسم کے سوال ہی پیدا نہیں ہوں گے۔ ایک اسلامی حکومت کے نہ رہنے سے نہ جانے کیا کیا ہو گیا؟

ع۔ چاندنی افسردہ، گل بے رنگ و بو، نغمے اداس۔ اک ترے جانے سے کیا بتلائیں کیا کیا ہو گیا۔

رشتہ مطلوب ہے

نہایت شریف متوسط حال خاندان کی دو سلیقہ شعار لڑکیوں کے لئے مناسب رشتے مطلوب ہیں۔ ایک لڑکی کی عمر (۲۳) سال ہے۔ دوسری کی (۲۱) سال۔ تعلیم دونوں کی ایف۔ اے تک ہے۔ شرافت اور معقول روزگار کے سوا کوئی مطالبہ نہیں ہوگا۔ خط و کتابت جو صیغہ راز میں رہے گی۔

(م۔ع) معرفت

ادارہ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ ۲۵۔ بی۔ لاہور

لفافے کے باہر "برائے رشتہ" کے الفاظ لکھ دیجئے۔

حقائق و عبر

انتخابات کس نے ملتوی کرائے تھے؟

آج کل یہ بحث عام چل رہی ہے کہ ۱۹۷۷ء کے عسکری انقلاب کے بعد، جب صدر ضیاء الحق نے اعلان کیا تھا کہ انتخابات نوّے دن کے اندر کرائے جائیں گے تو پھر ان کا التوا کس طرح ہو گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کے جواب میں مختلف افراد اور پارٹیاں اس کی ذمہ داری ایک دوسرے کے سر منسوب کر رہی ہیں۔ اب اکالعدم جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے تو حقیقت کچھ اور ہی سامنے آئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے "حکومت نے تو انتخاب کا پورا شیڈول مرتب کر لیا تھا۔ حلقہ بندیاں بھی مکمل کر لی گئیں تھیں۔ اور کاغذات نامزدگیاں بھی داخل کرائے جا چکے تھے کہ عین وقت پر قومی اتحاد نے کہا کہ وقت کم ہے اور اتنے دنوں میں ہم اپنے امیدوار کھڑے نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انتخابات کو ملتوی کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے قومی اتحاد سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر انتخابات مل گئے تو ملک اندھے کنوئیں میں جا گرے گا۔

صدر ضیاء الحق نے اس بات کو بنیاد بنا کر انتخابات ملتوی کر دیئے جس پر ہمنے صدر سے جھگڑا کیا کہ جو پارٹیاں انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں انہی کی خاطر کچھ سوچیں۔ اگر وہ حکومت نہ چلا سکیں تو پھر مارشل لاء لگا دیں انہوں نے کہا کہ حکومت چھوڑنا آسان نہیں"

(روزنامہ جنگ (لاہور) مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء صفحہ ۷)

جب مفاد پرستانہ اتحاد میں پھوٹ پڑ جائے تو وہ قوم کے حق میں "رحمت" ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے بڑے بڑے اہم راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ میاں صاحب نے پہلے فرمایا تھا کہ قومی اتحاد نظامِ مصطفیٰ کے قیام کیلئے نہیں تھا محض ایک شخص کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے تھا۔ (اس پر ہم طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۸۳ء میں تبصرہ کر چکے ہیں) اب انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ انتخابات ملتوی کرنے کا مشورہ بھی قومی اتحاد ہی نے دیا تھا! یعنی قومی اتحاد کا پہلا دعویٰ نظامِ مصطفیٰ کا قیام تھا اس کی یوں قلعی کھل گئی تھی۔ دوسرا دعویٰ بحالی جمہوریت تھا اس کی نقاب کشائی اسطرح ہو رہی ہے

خدا دندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

میاں صاحب نے فرمایا ہے کہ انہوں نے صدر مملکت سے جھگڑا کیا تھا کہ انتخابات ملتوی نہ کئے جائیں تاکہ ملک اندھے کنوئیں میں نہ گر جائے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ جب صدر مملکت نے ان کا مشورہ نہ مانا تو پھر وہ چھ سال تک، خاموش تماشائی بنکر ملک کے اندھے کنوئیں میں گرنے کا تماشہ کیوں دیکھتے رہے؟ انہوں نے ملک کو اس خطرے سے بچانے کے لئے کیا کیا؟

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف: (نوٹ: پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔)
لاہور	ہر جمعہ پونے ۸ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار پونے ۴ بجے صبح	76, PARK ROAD, ILFORD, TELEPHONE NO 553-1896
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFT WOOD AVE: #311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT.) M3N-2P3. TEL: (416) 661-2827
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب، رفیقی لین صدر (بالمقابل (VIP) MAIN GATE PESHAWAR STADIUM) شیریں محل 3 B یونیورسٹی ٹاؤن (بازہ روڈ) فون: ۴۴۴۵۹)
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف، محمود علی صاحب، اتمان خیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی-۱۴۴ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس، شہید روڈ لیہ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان ۸۴۳، نظامی منزل
فیصل آباد	ہر جمعہ پونے ۴ بجے شام	بمقام- حیات سرجری کلینک، ۲۳/۷ پیپلز کالونی ۱، فون: ۴۲۰۵۵)
ہنگو	ہر جمعہ پونے ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ۔ فون: (۶۷)
پنجکسی تحصیل کبیر والا (ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام: مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون: (۲۱۰۷۱)
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفا خانہ، عثمان پورہ (باہتمام ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر۔ توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب۔ گل روڈ (رسول لائن)
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ اور ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۲۰/۱-بی، بھمبر روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	۱- ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر ۲- ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب، واقع: L-K-234 کیہال (ایبٹ آباد) " غلام مصطفٰے اعوان صاحب واقع K-356 کنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)

محترم پرویز صاحب
کے
درسِ قرآن
بذریعہ
VCR
کے

کوائفِ اوقات و مقام
متعلقہ
بزم ہائے
طلوع اسلام

کراچی (پاکستان)

ہر جمعہ ۹½ بجے صبح
دارالزہرہ بالائی منزل
بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲۰
سرمد روڈ (کراچی صدر)

گجرات (پاکستان)

ہر جمعرات ۳ بجے سہ پہر
رہائش گاہ: ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب
جناح کالونی ٹیلیفون:
(گجرات) ۳۶۳۰
۳۰۴۰

اوسلو (ناروے)

ہر اتوار
شام ۴ بجے بمقام
MR MANZOOR AHMAD.
DOVRE GATE - 7/OSLO - 1

برمنگھم (انگلینڈ)

ہر ماہ کا پہلا اتوار
۲ بجے دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD
38.3BH (BIRMINGHAM)

دفتر ادارہ طلوع اسلام کے اوقاتِ کار

سنیچر تا جمعرات: ——— صبح دس بجے تا چھ بجے شام
بروز جمعہ: ——— صبح آٹھ بجے تا گیارہ بجے

مرتبہ: محمد اسلام، نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی

نگہِ بازگشت

(رہگذرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل)

(قسط پنجم)

اس سفرنامہ کی چار قسطیں، طلوعِ اسلام جولائی لغایت اکتوبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب پانچویں قسط پیشِ خدمت ہے۔ یہ یاد دہانی بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔

مخلوط انتخاب کا شاخسانہ

۱۹۵۵ء میں جب جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا شاخسانہ چھیڑ دیا گیا تو طلوعِ اسلام نے نومبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں اس پر ایک بھرپور اداریہ سپردِ قلم کیا تھا۔ اس میں دو قومی نظریہ کی سیاسی ہی نہیں دینی حیثیت پر بڑی تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا تھا:

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ذہنوں کے متعلق کیا کہا جائے، جن میں مخلوط انتخاب کا یہ باطل افروز تصور پیدا ہوا۔ ان زبانوں کے متعلق کن الفاظ میں گفتگو کی جائے۔ جنہوں نے اس اسلام سوز فتنے کو آگے پھیلایا اور ان ہاتھوں کا ذکر کس انداز سے کیا جائے جو اس زہر آلود خنجر کو سینۂ ملت میں پیوست کرنے کے لئے یوں بے باکانہ اٹھ رہے ہیں۔

طلوعِ اسلام نے ارکینِ دستور یہ اور کارفرمایانِ مملکت کو بایں الفاظ متنبہ کیا:

..... اگر دستور میں مخلوط انتخاب جیسے غیر اسلامی تصور کو ٹھونس دیا گیا تو ہم واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ روش زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گی..... اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کے باوجود جس دستور یہ کو آپ اسلامی کہہ کر مرتب کریں گے تو ہم اسے اسلامی سمجھ کر سر آنکھوں سے لگا لے گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔

سیاسی مقاصد مذہب کے نقاب میں

اس باب میں دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ انتشار اور اختلاف مملکتوں کو لے ڈوبتے ہیں۔ یہ اختلافات بالعموم سیاست کے پیدا کردہ ہوتے ہیں لیکن جب سیاسی مقاصد کو مذہب کا نقاب اوڑھا دیا جائے تو ان اختلافات کی نہ صرف شدت، بڑھ جاتی ہے بلکہ یہ مٹ ہی نہیں سکتے کھلی ہوئی سیاست میں، سیاسی پارٹیاں اپنے منشور بدلتی رہتی ہیں۔ لائحہ عمل میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ لوگ پارٹیاں بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن مذہب میں کسی قسم کی تبدیلی کفر اور ارتداد کا موجب قرار پا جاتی ہے نماز میں زیرِ ناف ہاتھ باندھنے اور سینہ کے اوپر ہاتھ باندھنے کا تعلق مذہب سے ہے یہ اختلاف قیامت تک رفع نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی سیاسی پارٹی کے منشور میں یہ شق داخل ہو جائے کہ اس کے ممبر وہی ہو سکتے ہیں جو سینے پر ہاتھ باندھیں تو یہ پارٹی کسی دوسری پارٹی سے اس باب میں مفاہمت کر ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ان کے اختلافات مٹ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا کسی قوم میں مستقل انتشار موجود رکھنے کے لئے اور کسی مملکت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی سیاست کو مذہب کے ساتھ ملوث کر دیا جائے (ہم مذہب کہہ رہے ہیں دین نہیں۔ دین میں تو اختلافات اور تفرقہ بازی رہ ہی نہیں سکتی۔)

(طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۹ء صـ۲)

شرعی سزائیں کیوں نہیں دی جاتیں

ملک میں مذہبی پیشوائیت کیطرف سے شور مچایا جا رہا ہے کہ حکومت نے بادلِ نخواستہ شرعی قوانین (یعنی قوانینِ حدود) نافذ تو کر دیئے ہیں لیکن ان کے مطابق مجرموں کو سزائیں نہیں دی جا رہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت بدنیت ہے وہ یہاں اسلام رائج ہی نہیں کرنا چاہتی۔ حکومت کی اس سازش میں پولیس بھی برابر کی شریک ہے اور عدلیہ بھی ملوث۔ طلوعِ اسلام نے اکتوبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شرعی قوانین، جرم زنا، جرمِ قذف، جرم سرقہ اور جرم شراب نوشی پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد لکھا:

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے یہ واردا تیں ان جرائم کے زمرے میں آ سکتی ہیں جن کی سزا "شرعی حد" ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ملک کے ارباب علم و بصیرت سے کہ ان شرائط کی رُو سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی واردات بھی ایسی ہو سکتی ہے جس میں جرم ثابت ہو جائے؟ لہٰذا اگر ان قوانین کی رُو سے مجرم کو حد کی سزا نہیں دی گئی تو اس میں پولیس کی کون سی سازش ہے اور عدلیہ کا کون سا قصور تھا؟ یہ نمبیمت ہے کہ متعلقہ آرڈی ننس میں یہ سمجھ دیا گیا ہے کہ اگر جرم حد کی سزا کا مستوجب نہ قرار پا سکتا ہو تو پاکستان کے ضابطۂ فوجداری کے تحت اسکا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ پولیس اس قسم کی وارداتوں کا چالان بھی ضابطۂ فوجداری کے تحت کرتی ہے اور عدالت اس کی سزا بھی اسی ضابطہ کے مطابق دیتی ہے اگر آرڈی ننس میں یہ گنجائش نہ رکھی جاتی تو کسی مجرم کو کسی قسم کی سزا نہ مل سکتی۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اسے بھی اپنے پروپیگنڈا کا حصہ بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پولیس جان بوجھ کر (بلکہ رشوت لے کر) واردا توں

کا چالان ضابطۂ فوجداری کے تحت کرتی ہے۔ کیونکہ اس سے سزا کم ملتی ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ ضابطۂ فوجداری کی متعلقہ دفعات کو منسوخ کر دینا چاہیئے اور جو عدالتیں ان دفعات کے تحت مقدمات کی سماعت کرتی ہیں ان عدالتوں کو بند کر دینا چاہیئے۔

تجویز نہایت "معقول" ہے۔ مجرمین کو ضابطۂ فوجداری کے تحت سزائیں مل نہیں سکیں گی اور شرعی حدود کی شرائط پوری نہیں ہو سکیں گی تو ملک میں وارداتوں کے میخانے کھل جائیں گے اور مجرم قانونِ شریعت زندہ باد کے نعرے بلند کرتے دندناتے پھریں گے۔

اس ضمن میں ہم دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ ایک سوال سامنے لانا چاہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ قوانین فقہ حنفی پر مشتمل ہیں۔ اس لئے اس فقہ کے ماننے والوں کی مجبوری قابلِ فہم ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ فقہی قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

لیکن ان قوانین کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل میں زیرِ بحث آیا۔ اس کے تمام ارکان تو قدامت پرست نہیں۔ پھر یہ وفاقی حکومت کی وزارتِ امورِ مذہبیہ کے بھی زیرِ غور آیا ہوگا۔ وہ وزارت بھی مولانا حضرات پر مشتمل نہیں۔ اس کے بعد یہ وزارتِ قانون میں زیرِ بحث آیا ہوگا۔ وہ وزارت تو بہرحال قانون دان حضرات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کابینہ میں بھی زیرِ غور آیا ہوگا۔ یہ کہنا تو ہمارے نزدیک ان حضرات کی عقل و بصیرت کی توہین ہے کہ وہ اتنا فہم و شعور بھی نہیں رکھتے کہ وہ ان قوانین کے استحکام کو سمجھ نہ سکے ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسے قوانین کو کس طرح نافذ کر دیا۔ اس کا جواب وہی حضرات دے سکتے ہیں۔

ان کا جواب کچھ بھی ہو اس سے ہمارے علماء کرام کا حربہ ضرور کامیاب ہو گیا۔ انہوں نے پہلے اس قسم کے ناممکن العمل قوانین نافذ کرائے اور پھر پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ان پر عمل نہیں کرایا جا رہا۔ اس سے خود تو عوام کی نظروں میں اسلام کے سب سے بڑے مجاہد بن گئے اور انتظامیہ، عدلیہ بلکہ خود حکومت کے متعلق مشہور کر دیا کہ یہ اسلام کو رائج ہی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے پروپیگنڈے کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ یہ قوانین ایسے ہیں ہی نہیں جن پر عمل کیا جا سکے۔ لیکن اربابِ اقتدار یہ جواب بھی نہ دے سکے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنے سے پبلک کی طرف سے پوچھا جائے گا کہ اگر یہ قوانین ایسے ہی ناممکن العمل تھے تو آپ نے انہیں نافذ کیوں کیا؟

یہ ادنیٰ سی مثال ہے اس تذبذب اور خلفشار کی جس کا شکار وہ ملک ہوتا ہے جس میں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہو۔ اس کے بعد اب سوچیئے کہ اگر (خدانخواستہ) کہیں اقتدار بلاواسطہ ان لوگوں کے ہاتھ آ جائے تو انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ یہ وجہ تھی جو بانیانِ پاکستان علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ بار بار اعلان کرتے تھے کہ کچھ بھی ہو، پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائیگی۔ ص ۶۳-۶۴

اسلام میں سیاسی پارٹیوں کا تصوّر

صدرِ مملکت نے اپنے (INDIA TODAY) کے انٹرویو میں، ایک سوال کے جواب میں یہ بھی کہا کہ اسلام میں پولیٹکل پارٹیز (سیاسی جماعتوں) کا تصوّر ہی نہیں ہے۔ جو چیز بھی دو مسلمانوں میں اختلاف اور افتراق

(RIFT) پیدا کرنے کا موجب ہو وہ غیر اسلامی ہے اور سیاسی جماعت کا پہلا اصول اختلاف اور افتراق پیدا کرنا ہوتا ہے، ورنہ وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔
(پاکستان ٹائمز یکم مارچ ۱۹۸۰ء)

طلوعِ اسلام نے اپریل ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:-

صدرِ مملکت نے بالکل بجا فرمایا کہ جو چیز بھی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہو وہ خلافِ اسلام ہے اس میں شبہ نہیں کہ سیاسی جماعتیں بھی امّت میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں اس لئے ان کا وجود خلافِ اسلام ہے لیکن سیاسی جماعتوں سے کہیں زیادہ تفرقہ کا موجب مذہبی فرقے ہیں۔ اس لئے ان کا وجود بھی غیر اسلامی ہے۔ سیاسی جماعتیں تو بنتی ہیں، بگڑتی ہیں، ابھرتی ہیں، مٹتی ہیں۔ انہیں (BAN) بھی کیا جا سکتا ہے۔ کالعدم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن مذہبی فرقے اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں اور امّت میں تفرقہ ہی نہیں، شاید نفرت اور عداوت پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کا موجب ہیں۔ انہیں نہ مٹایا جا سکتا ہے نہ (BAN) کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کا پیدا کردہ تفرقہ عارضی اور تغیر پذیر ہوتا ہے لیکن مذہبی فرقوں کا پیدا کردہ تفرقہ مستقل اور غیر متبدل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس معاشرہ میں تفرقہ انگیزی کی ایسی شدید (اور غیر اسلامی) علّت موجود ہو، اس میں اسلامی نظام کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے تو بہ نصِ صریح فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۲) اس لئے امّت میں وحدت پیدا اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقے دونوں کو مٹانا ضروری ہے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ مذہبی فرقے تو مٹائے نہیں جا سکتے تو پھر اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ بحالتِ موجودہ اسلامی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنی فقہ قابلِ تسلیم نہیں ہے

حکومت پاکستان نے زکوٰۃ کے متعلق ایک قانون وضع کیا اور اسے پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کیا۔ یعنی ایسا قانون جس کا اطلاق سب پر یکساں ہو۔ اس کے خلاف فرقہ وارانہ احتجاج ہوا تو حکومت کو اس قانون کو شخصی قانون (PERSONAL LAW) کی شکل دینی پڑی اور احکام جاری کر دیئے گئے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے اس کے لئے آئینِ پاکستان میں بھی ترمیم کی گئی۔ اس نظیر (PRECEDENCE) کی رُو سے یہ نظر آتا ہے کہ ملک میں شاید ہی کوئی پبلک لاء نافذ ہو سکے۔ جب فقہ غالب رہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کا مطالبہ کرے گا۔

زکوٰۃ کے متعلق جو کہا گیا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق ادا کر سکتا ہے تو اس سے ایک عجیب لیکن نہایت عبرت آموز حقیقت سامنے آئی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ فقہ قرآنی کے پابند ہیں اس لئے وہ اس کے مطابق عمل کریں گے۔ انہیں جواب ملا کہ قرآنی فقہ مسلّمہ فقہ نہیں۔ اس لئے آپ اس کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔ یا تو آپ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی فقہوں میں سے کسی فقہ پر عمل کریں اور یا پھر قانونِ مملکت کے مطابق زکوٰۃ ادا کریں۔ یعنی انسانوں کی وضع کردہ فقہیں تو مسلّمہ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی متعین فرمودہ فقہ قابلِ تسلیم نہیں

یا کعب!! یہود و نصاریٰ تو خدا کے ساتھ اپنے علماء و مشائخ کو خدا بناتے تھے یہاں کہا جاتا ہے کہ تم صرف فقہ کو خدا بنا سکتے ہو۔ خدا کو نہیں۔ (طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۲ء صفحہ ۲۲-۲۳)

فرقے کیسے بنتے ہیں؟

طلوعِ اسلام نے اگست ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں اس موضوع پر شرعی عدالت کے دو فیصلوں کی مثال دیتے ہوئے لکھا:۔

پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دیا کہ رجم (سنگساری) کی سزا کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ حکومت نے عدالت کی تدوین نو کی اور اس سے کہا کہ اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرے۔ عدالت نے نظرِ ثانی کے بعد فیصلہ صادر کیا کہ رجم کی سزا کتاب و سنت کے مطابق ہے۔

اس وقت تو دونوں عدالتیں مملکتِ پاکستان کے زیر قوانین ہیں اس لئے ملک میں دوسرا فیصلہ ہی نافذ ہوگا۔ لیکن بعد کے زمانے میں، جب نہ یہ مملکت ہوگی، نہ عدالتیں۔ تاریخ کے سامنے دو فیصلے ہوں گے، ایک دوسرے سے متضاد۔ اور دونوں کی بنیاد اس دعویٰ پر ہوگی کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں۔ ایک گروہ اس "کتاب و سنت" کی پیروی کرے گا جس کی رُو سے رجم خلافِ اسلام قرار دیا گیا تھا۔ دوسرا گروہ، دوسرے فیصلے کی۔ دونوں فیصلے فقہ کے مجموعوں میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح دو فقہی فرقے وجود میں آجائیں گے موجودہ فرقوں کی طرح بھی کچھ اسی طرح پڑی تھی۔ فیصلہ کی بنیاد اگر قرآنِ خالص کو قرار دے دیا جاتا تو نہ موجودہ عدالتیں دو متضاد فیصلے دیتیں نہ بعد میں دو فرقوں کے وجود میں آنے کا امکان رہتا۔

نظریۂ ضرورت

نظریۂ ضرورت کیا ہے؟ اور یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی، عوام کے استفسارات پر طلوعِ اسلام نے فروری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں لکھا:۔

آج کل ہمارے ہاں اسی قسم کی ایک نظری بحث اس عنوان کے تحت چل رہی ہے، کہ "نظریہ ضرورت" اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ یعنی یہ تو ابھی تک یہاں کھلے نہیں پایا کہ کسی بات کے اسلامی قرار پانے کا معیار کیا ہے اور کیفیت یہ ہے کہ کسی کو چھینک بھی آجائے تو اس کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے پر بحث چھڑ جاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ "نظریۂ ضرورت" کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق اور باطل جائز اور ناجائز کے کوئی ایسے حدود نہیں جنہیں کسی حالت میں بھی توڑا نہ جا سکے۔ مصلحت کا تقاضا ہو تو ناجائز بھی جائز قرار پا سکتا ہے۔ یہ نظریہ سیکولرازم کا ہے۔ جس کا بانی اٹلی کا مشہور سیاست دان میکیا ولی تھا۔

طلوعِ اسلام نے میکاولی (MACHIAVELLI)، فریڈرک ورم وغیرہ علمبرداران کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے لکھا:۔

یہ ہے وہ نظریۂ ضرورت جس پر سیکولرازم کی عمارت استوار ہے اور جو آجکل اقوامِ عالم کا سیاسی مسلک ہے۔ (اور جس کی وجہ سے یہ دنیا جہنم بن رہی ہے) اس نظریہ کے مفہوم کے متعلق کسی فلسفیانہ بحث کی ضرورت نہیں، یہ صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ ہمارے سامنے آتا ہے جب آپ کسی کو کہتے ہیں کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟

تو وہ کھٹ سے جواب میں کہہ دیتا ہے کہ "مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا" یعنی وہ سچا اس وقت تک رہتا ہے جب تک اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ ہو۔ ضرورت ہو تو وہ بلا توقف جھوٹ بول دے گا۔

اسلامی یا غیر اسلامی

ہمارے ہاں اس نظریہ کے متعلق بحث ہو رہی ہے کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی! اس نظریہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی بحث لاہور ہائیکورٹ کے (حالیہ) چیف جج، جسٹس جاوید اقبال کے اس بیان سے ہوئی جو انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا۔ اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق:۔

> انہوں نے کہا کہ "نظریۂ ضرورت" ایک اسلامی نظریہ ہے۔ اس کی سب سے پہلے وضاحت ایک مسلمان مفکر الماوردی نے کی تھی لیکن کم علمی کی وجہ سے لوگ اس نظریہ کو ایک غیر مسلم سے منسوب کر رہے ہیں۔ (جنگ لاہور مورخہ ۸۔ نومبر ۱۹۸۲ء)

صدیوں کی غلامی سے قوم میں خود اعتمادی کے فقدان، اور ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کے جو جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اس کا نتیجہ تقلید ہوتا ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ بجائے اس کے کہ مسئلہ زیر نظر کے متعلق انسان خود تحقیق کرنے کے بعد پوری خود اعتمادی کے ساتھ کسی نتیجہ پر خود پہنچے، وہ اسلاف میں سے کسی کو بطورِ سند پیش کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے دعویٰ کے حق میں ثبوت مہیا کر دیا۔ الماوردی، دورِ عباسیہ (پانچویں صدی ہجری) کا ایک فقیہہ اور سیاست دان تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس کا کوئی قول یا نظریہ (اسلامی ہونے کی حیثیت سے) ہمارے لئے سند کیسے قرار پا سکتا ہے؟ مودودی (مرحوم) کے الفاظ میں "یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے"۔ (تفہیمات حصہ دوم سنہ ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۳۶؟) الماوردی کا سند پانا تو ایک طرف یہ بھی کھلے نہیں پا سکا کہ اس نے یہ کچھ کہا بھی ہے یا نہیں۔

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

ہمیں حیرت ہے کہ یہ حضرات ہزار سال پیچھے جا کر کسی الماوردی کی سند پیش کرتے ہیں تو ان کی نگاہ خود اپنے دور کے ایک "مجتہد" اور اقامتِ دین کے داعی کی طرف کیوں نہیں اٹھتی؟ ہماری مراد سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) سے ہے جنہوں نے اس زمانے میں "نظریۂ ضرورت" کو بڑے طمطراق سے پیش کیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ ان کے کچھ نامور رفقاء نے ان کے خلاف کچھ الزامات عائد کئے جن کے جواب میں انہوں نے اس نظریہ کو پیش کیا۔ جھوٹ بولنے کے جواز میں انہوں نے کہا:۔

> راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن مئی سنہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۵۲)

یہ اور دیگر اقتباسات پیش کرنے کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

"نظریۂ ضرورت" کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے کیا یہ سندات کافی نہیں جو الماوردی کو بحث میں لایا جائے؟

پاکستان میں ویسے بھی مودودی مرحوم کے برانڈ کا اسلام رائج کیا جا رہا ہے۔ اس میں یہ نظریہ بھی شامل ہو جائے گا۔ مودودی مرحوم نے یہ ارشادات رقم فرمائے تھے تو (ان کے مذکورہ بالا رفقا تو ان سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن) اس پر مذہبی حلقوں میں سے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ لہٰذا ان کی طرف سے اب بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ اعتراض طلوعِ اسلام نے کیا تھا اور حسبِ معمول گالیاں کھائی تھیں۔

نظریۂ ضرورت درحقیقت سیکولرازم کا دوسرا نام ہے

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ "نظریۂ ضرورت" درحقیقت سیکولرازم کا دوسرا نام ہے۔

سیکولرازم کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پر خارج سے عائد کردہ کوئی پابندی نہیں، وہ اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہے جیسا (مصلحت کا تقاضا ہو ویسا کر لیا جائے)۔ یہ ہے سیکولرازم یا نظریۂ ضرورت۔ شخصی حکومتوں میں ایسے فیصلے سربراہِ مملکت کرتا ہے۔ مغرب کے جمہوری نظام میں، انسانوں کی اکثریت۔

اسلام اس نظریہ کی ضد ہے

اسلام اس نظریہ، ازم اور مسلک کی بالکل ضد ہے (جب ہم اسلامی کہیں گے تو اس کی سند قرآنِ کریم ہوگی) اس کا موقف یہ ہے کہ انسانی زندگی (انفرادی اور اجتماعی) کے لئے خدا نے کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جو ان پابندیوں کو تسلیم کرتا ہے اسے مسلم کہا جاتا ہے اور جو نظام ان پابندیوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کارفرما ہوتا ہے اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ یہ پابندیاں (یا حدود) اقدار، اصول، احکام اور قوانین کی شکل میں قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ "ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب متعین کرتی ہے"۔ یہ پابندیاں ابدی ہیں اور غیر متبدل۔

اسی شمارہ میں طلوعِ اسلام آگے چل کر لکھتا ہے:-

اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس کی ضرورت پیش آگئی وہ اس طرح کہ نظریۂ ضرورت کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے قرآن کے اس استثنا کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ اسے پیش کیا گیا ہے وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس شیخ آفتاب حسین کی طرف سے انہوں نے فرمایا ہے "نظریۂ ضرورت کو قرآنِ مجید نے جائز قرار دیا ہے اور پوری اسلامی تاریخ میں نظریۂ ضرورت کارفرما نظر آتا ہے"۔ انہوں نے قرآنِ مجید کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "موت سے بچنے کے لئے سؤر کا گوشت کھانا حلال ہے۔ یہ سؤر کا گوشت نظریۂ ضرورت کے تحت ہی حلال ہوتا ہے۔ (جنگ لاہور، ۱۹ نومبر ۱۹۸۲ء)

موصوف کی اس دلیل پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

.... اس سلسلہ میں بصد ادب گذارش ہے کہ (۱) قرآنِ کریم نے "اضطرار" کا لفظ استعمال کیا ہے "ضرورت" کا نہیں۔ ضرورت کا لفظ تو سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ ضرورت اور اضطرار کا فرق عربی لغت سے واقف حضرات پر روشن ہے (جیسا کہ متعلقہ آیات کے ترجمہ کے سلسلہ میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) مولانا محمود الحسنؒ نے اضطرار کا ترجمہ۔ بے اختیاری اور لاچارگی کیا ہے۔ شاہ رفیع الدینؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے "پھر جو کوئی بے بس ہو جائے"۔

قرآن مجید کے انگریزی مترجمین نے اس کا ترجمہ (FORCED) (COMPELLED) کیا ہے (LANE) نے اپنے لغت میں لکھا ہے:۔ (FORCED - OR DRIVEN TO .. AGAINST HIS WILL)
ان تراجم اور معانی سے ضرورت اور اضطرار کا فرق واضح ہو جائے گا۔ قرآنِ مجید نے اس مجبوری اور بے بسی کو بھوک کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ یہ ایسا طبعی تقاضا ہے جس سے متعلقہ شخص بھی محسوس اور معلوم کر سکتا ہے کہ اضطراری (مجبوری کی) حالت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں اور دوسرے لوگ بھی اسے محسوس اور معلوم کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے "ضرورت" کوئی محسوس اور مرئی کیفیت نہیں۔ ویسے بھی ہر شخص کا "ضرورت" کا پیمانہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ ایک چیز ایک شخص کے نزدیک ضرورت ہے دوسرے کے نزدیک ضرورت نہیں۔ اگر حرام شے کو حلال قرار دے لینے کا معیار اپنی اپنی ضرورت ہو تو معاشرہ میں جس قسم کی لاقانونیت (ANARCHY) پیدا ہو جائے گی ظاہر ہے
(۲) اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت خود دی ہے کسی اور کو اس کا مجاز نہیں ٹھہرایا۔ (۳) یہ اجازت صرف اس مخصوص حالت (بھوک کی وجہ سے مجبوری) کے ضمن میں ہے کسی انسان کو اس کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس اجازت کا سہارا لے کر اپنی ضرورت کے مطابق ہر ناجائز کو جائز قرار دے لے۔ محترم جسٹس اس قانونی نکتہ سے بخوبی واقف ہوں گے کہ کسی مقید قانون کو مطلق قرار دے لینے سے قانون کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہتی۔ خود قرآنِ کریم نے بھی اس کے سوا کسی حالت کو اضطراری قرار نہیں دیا ہے۔ جسٹس ممدوح نے فرمایا ہے کہ "پوری اسلامی تاریخ میں نظریۂ ضرورت کارفرما نظر آتا ہے"۔ سو گذارش ہے کہ ہماری یہ تاریخ "اسلامی تاریخ" نہیں۔ وہ ملوکیت کی تاریخ ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ ملوکیت کا تو تمام کاروبار "نظریۂ ضرورت" کے تحت چلتا ہے اس میں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی ہوتی نہیں۔ صاحبِ اقتدار کی ضرورت اور مصلحتِ مملکت کا قانون قرار پا جاتی ہے۔ اس کے برعکس خلافت (اسلامی مملکت) قرآنِ مجید کی عائد کردہ پابندیوں کے دائرے میں گھری ہوتی ہے اور کسی مصلحت کے تحت بھی ان سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

استخلاف پوری اُمت کیلئے ہے:

استخلاف فی الارض کسی ایک فرد کو نہیں پوری امت کے لئے ہے۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے مارچ ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں لکھا: قرآنِ کریم کی رُو سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے حقِ حکومت حاصل ہے، یا خدا نے اسے اس منصب کے لئے مامور کیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ اسلامی مملکت کے سب سے پہلے سربراہ تھے لیکن ان کی یہ سربراہی رسول ہونے کی حیثیت سے تھی، اس لئے وہ تو ایسا کہنے میں حق بجانب تھے کہ انہیں اس منصب کے لئے خدا نے مامور کیا ہے۔ نبوت حضورؐ پہ ختم ہو گئی۔ اس لئے حضورؐ کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے اس منصب پر خدا نے فائز کیا ہے اور ان ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے وہ مامور من اللہ ہے۔ ایسا کہنا یا تو دعوائے نبوت کے مترادف ہے ..... یا تھیا کریسی، جو (دونوں) اسلام کی نقیض ہیں۔ اسلام کی رُو سے، نہ سلطان زمین پہ خدا کا سایہ (ظل اللہ علی الارض) ہوتا ہے، نہ خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل۔ وہ دیگر افرادِ امت جیسا امت کا ایک فرد ہوتا ہے۔ استخلاف پوری کی پوری امت کے لئے ہے اور جس شخص کو امت اپنے میں سے منتخب

کرلے، وہ اس مملکت کا سربراہ ہوسکتا ہے اور اس وقت تک سربراہ رہ سکتا ہے جب تک اسے امت کی تصویب (رضامندی) حاصل ہے۔ خدا نہ کسی کو مقرر کرتا ہے نہ برطرف۔

احکامِ شریعت

شریعت اس راستے کو کہتے ہیں جو اس ندی کی طرف جائے جو رواں ہو اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے اپنی مندرجہ بالا اشاعت میں لکھا:-

اسلامی مملکت میں اصول و اقدار غیر متبدل ہوں گے۔ ان میں نہ تغیر و تبدل ہوگا، نہ حک و اضافہ۔ مملکت کا فریضہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصول و اقدار و احکام کو نافذ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس کا فیصلہ امت کی منتخب کردہ مجلسِ مشاورت (اسے آجکی اصطلاح میں پارلیمان کہہ لیجئے) کریگی۔ اس کے لئے ان اٹھارہ علوم کی قطعاً ضرورت نہیں ہوگی جنہیں حاصل کرنے کے بعد بیچارہ طالب علم نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا، اس لئے کہ وہ ایک وقت کی روٹی کمانے کے بھی قابل نہیں رہتا۔ اس مقصد کے لئے ضرورت اتنی ہوگی کہ قرآنِ کریم پر گہری نگاہ ہو اور اپنے زمانے کے تقاضوں اور تحریکوں کا علم ہو۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جو جزئی قوانین مرتب کئے جائیں گے انہیں احکامِ شریعت کہا جائے گا۔ یہ جامد نہیں ہوں گے۔ مقتضیاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ قابلِ تغیر و تبدل ہوں گے۔

سند صرف خدا کی کتاب ہے

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ اور ذمہ داری کتاب اللہ کے اصول و احکام کو عملاً نافذ کرنا ہے۔ ان موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے اسی شمارہ میں انتباہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

طلوعِ اسلام نہ عملی سیاست میں حصہ لیتا ہے، نہ اسے اقتدار سے کسی قسم کا سروکار ہے۔ اسے تعلق ہے تو اس بات کا کہ جو بات قرآنی نقطہ نگاہ سے اسلامی نہیں قرار پا سکتی، اسے اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو حضرات، بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی جہت سے بھی اس سے وابستہ ہوں، ہم ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ وہ کس قدر عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لے رہے ہیں۔ اور کل کو خدا کے حضور اس کا کیا جواب دیں گے۔ جو لاکھوں کروڑوں مسلمان، ان غیر قرآنی مسالک و قوانین کو اسلامی سمجھ کر اختیار کریں گے، ان کے گناہوں کا بوجھ کس کی گردن پر ہوگا؟ وہ سوچیں کہ کہیں (خدانخواستہ) ان کا شمار ان لوگوں میں تو نہیں ہوگا جن کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ لِيَحْمِلُوٓا۟ أَوْزَارَهُمْ (۱۶/۲۵) جو اپنے اعمال کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے اعمال میں سے بھی کچھ بوجھ جنہیں یہ اسطرح بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ سوچیں کہ جب بروزِ حشر حضور نبی اکرمؐ خدا سے فریاد کریں گے کہ يَٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِى ٱتَّخَذُوا۟ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ مَهْجُورًا (۲۵/۳۰) "اے میرے پروردگار! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا" تو حضورؐ کی انگلی آپ کی طرف تو نہیں اٹھے گی؟ سوچئے کہ یہ باتیں گہری سوچ کی متقاضی ہیں۔ ان کا تعلق محض دنیاوی حکمرانی سے نہیں، اُخروی مؤاخذہ سے بھی ہے۔ حضورؐ کی فریاد یہ نہیں ہوگی کہ انہوں نے فقہ اور حدیث اور اسلاف کے مسلک

کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

پاکستان کا خطۂ ارض آماجگاہ ہے مسلسل سازشوں، ولولہ انگیزیوں، افسانہ طرازیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کا۔ ان میں سب سے بڑی سازش جو اس کے خلاف کی جا رہی ہے، یہ ہے کہ اس مقصد ہی کو سرے سے مشکوک بنا دیا جائے جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ اپنے بیگانے سب اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اسے اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں ایسی مملکت قائم کی جائے جو قرآنی نظام کی مظہر ہو۔ لیکن یہاں وقتاً فوقتاً ایسی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں جن سے یہ مترشح ہو کہ اسے قرآنی مملکت بننے کے لئے نہیں بلکہ سیکولر سٹیٹ بننے کیلئے حاصل کیا گیا تھا۔

کچھ عرصہ سے ان ولولہ انگیزیوں کی شدت میں کمی آ رہی تھی لیکن ان میں اب پھر تندی اور تیزی پیدا ہو رہی ہے۔ چونکہ قرآنی مملکت کا قیام طلوعِ اسلام کا جزوِ ایمان ہے اسلئے جب اور جہاں بھی اس قسم کی سازش کی نمود ہوتی ہے یہ اس کی تردید اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے۔

حالیہ فتنہ انگیزی کی اہمیت اس لئے بھی بڑھی جاتی ہے کہ جس قسم کا اسلام پاکستان میں نافذ کیا جا رہا ہے اس سے ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس نتیجہ پر پہنچ رہا ہے کہ اس سے تو سیکولرازم ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس قسم کے احساسات کے نتائج بڑے خطرناک اور دوررس ہیں اس لئے اس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے کہ قائدِ اعظمؒ جہاں سیکولرازم کے مخالف تھے وہ وہاں اس قسم کے اسلام کے بھی مخالف تھے جسے تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ وہ پاکستان کو قرآنی مملکت بنانا چاہتے تھے۔

جب (مرحوم) جسٹس منیر نے اسی قسم کے اعتراضات اٹھائے تھے تو پرویز صاحب نے ان کے جواب میں ایک جامع مقالہ تحریر فرمایا تھا جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس مقالہ کو بلا کم و کاست دوبارہ شائع کرتے ہیں۔ اور اس کے آخر میں ان شواہد کا اضافہ کرتے ہیں جو سابقہ مقالہ میں درج نہیں ہوئے تھے۔

چونکہ سابقہ مقالہ عکسی طور پر شائع ہو رہا ہے اس لئے استدعا ہے کہ جسٹس منیر کے اسمِ گرامی کے ساتھ (مرحوم) کا اضافہ کر لیا جائے کیونکہ وہ اس اثناء میں وفات پا چکے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

(پرویز)

۱۹۷۹ء میں محترم محمد منیر (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان کی کتاب (FROM JINNAH TO ZIA) شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے اس سابقہ خیال کو دہرایا ہے کہ ــــ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ــــ محترم محمد منیر نے ۱۹۶۴ء میں روزنامہ "پاکستان ٹائمز" میں ایک مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا (DAYS TO REMEMBER) اس کے آخر میں انہوں نے لکھا تھا:-

تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔

طلوعِ اسلام بابت اگست ستمبر ۱۹۶۴ء میں اس کا مؤاخذہ کیا گیا تھا۔ میں نے محترم جسٹس کی کتاب کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا کیونکہ میرے خیال میں یہ بات کہنا کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ایسا ہی ہے جیسے کل کو کوئی مؤرخ یہ لکھ دے کہ قائدِ اعظمؒ لنگوٹ باندھ کر مسٹر گاندھی کی پرارتھنا میں جایا کرتے تھے۔ یعنی بدیہیات کو جھٹلانا۔

لیکن میرے ایک بالغ نظر دوست نے مجھ سے کہا ہے کہ محترم جسٹس کی اس کتاب سے پاکستان کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ طبقہ جو شروع ہی سے پاکستان کے قیام کے خلاف تھا، ہمارے نوجوان طبقہ میں یہ خیال عام کر رہا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد اس مملکت کو سیکولر بنانا تھا۔ اس کی تائید میں وہ محترم جسٹس کی کتاب کو بطور سند پیش کرتا ہے۔ اور چونکہ محترم جسٹس کے نام کو ان کے سابقہ منصب اور بزرگی کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے یہ پروپیگنڈہ خاصا اثر انداز ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس طبقہ میں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ جب پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا مقصود تھا تو

ہندوستان سے الگ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ اس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ان سطور کا جذبۂ محرکہ یہی ہے۔ میں اس سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائداعظمؒ کے ضمن میں بالخصوص جو کچھ میں کہتا چلا آرہا ہوں اور کہوں گا، وہ شنید نہیں، دید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) ۱۹۳۰ء کا پاکستانی ہوں، جب علامہ اقبالؒ نے (الہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے، اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصوّر پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائداعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوعِ اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا، اور وہ پاکستان کی اصل و اساس کے تحفظ کے سلسلہ میں، جس کثرت اور شدت سے لکھتا چلا آرہا ہے، شاید ہی کوئی پاکستانی ایسا ہو جو اس سے ناواقف ہو۔ بنابریں، میں اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کروں گا وہ شنید نہیں، دید ہوگا۔ لیکن "دید" سے یہ مراد نہیں کہ میں زبانی روایات پیش کروں گا۔ بلاسند زبانی روایات سے تو تاریخ مسخ ہو جاتی ہے۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائداعظمؒ کے ان بیانات، اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں اور انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔

محترم جسٹس نے اپنے دعاوی کو ان الفاظ میں سمیٹ کر بیان کیا ہے۔

۱۔ قائداعظمؒ سیکولر ڈیموکریٹک مملکت چاہتے تھے یعنی ایسی سٹیٹ جس میں مذہب کو کاروبارِ مملکت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔ (صفحہ ۱۰۳)

۲۔ پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام کا خیال نہ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا نہ قائداعظمؒ کے (صفحہ ۳۴)

۳۔ اسلامی مملکت کا تصور قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی بار ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان (مرحوم) نے قراردادِ مقاصد کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا۔ انہوں نے اس قرارداد کو قائداعظمؒ کی زندگی میں اس لئے پیش نہ کیا کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ (صفحہ ۳۶)

اپنے اس دعوے کی تائید میں محترم نے دو دلائل پیش کئے ہیں:۔

۱۔ قائداعظمؒ نے بار بار کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ (صفحہ ۳۰، صفحہ ۳۲، صفحہ ۳۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے۔

۲۔ انہوں نے اپنی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں اسے واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کی مملکت سیکولر ہوگی۔ (صفحہ ۳۰)

قبل اس کے کہ میں واضح کروں کہ قائداعظمؒ پاکستان میں کس قسم کی سٹیٹ چاہتے تھے، میں (جسٹس ممدوح کی بزرگی کے احترام کے باوجود) اتنا گزارش کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ دلیل کہ چونکہ قائداعظمؒ تھیاکریسی نہیں چاہتے

تھے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے، بڑی رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اسی طرح خلافِ اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائدِ اعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے، اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں؟ اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیتِ گورنر جنرل، فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا:-

> پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔
>
> (تقاریر بحیثیتِ گورنر جنرل۔ ص۶۵)

تھیاکریسی کی مخالفت

اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائدِ اعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تھیاکریسی وہ نظامِ حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ قائدِ اعظمؒ اس طرزِ حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا۔

مجھے انتہائی افسوس بلکہ دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ محترم جسٹس نے اپنی کتاب میں قائدِ اعظمؒ کے اس براڈ کاسٹ کو نقل کیا ہے لیکن اس فقرہ تک کہ "ہم ان کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں"۔ اس کا اگلا فقرہ جس میں قائدِ اعظمؒ نے واضح کیا تھا کہ تھیاکریسی کیا ہوتی ہے انہوں نے حذف کر دیا ہے۔ (کتاب ص۳۱، ص۳۰) ان کی بزرگی کا احترام ہمیں اس باب میں کچھ کہنے سے مانع ہے۔ عدالت کی میزان میں اسے کیا کہا جائے گا، اس کے متعلق ان سے بہتر فیصلہ اور کون دے سکے گا۔

اقبالؒ کی طرح قائدِ اعظمؒ بھی تھیاکریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف۔ اس لئے کہ تھیاکریٹک سٹیٹ اور اسلامک اسٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تھیاکریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ (میں اس مقالہ کو، جسٹس ممدوح کی کتاب کے حوالے سے قائدِ اعظمؒ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں) یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب

(لاہور) کی ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:-

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ "اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ——— "حسبنا کتاب اللہ" ——— ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔"

(خطباتِ اقبالؒ)

قائداعظمؒ نے ۵ فروری ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ "مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں ..... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں"۔ (تقاریر قائداعظمؒ۔ حصہ اوّل۔ ص ۴۸) اس سے ان کی مراد، تھیاکریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر جناحؒ۔ شائع کردہ۔ شیخ محمد اشرف۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۶)

اِسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات

وہ تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسلامک سٹیٹ کے اصول و مبانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (میں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطۂ ارتکاز یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد

(دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبار کو ۱۹۴۱ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا تھا:-

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصولاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔
>
> (اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور مورخہ ۸ر فروری ۱۹۴۲ء) [۲]

ہمیں امید ہے کہ اس سے محترم جسٹس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قائداعظمؒ متھیا کریسی کی مخالفت کے بعد کس قسم کا سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔

مطالبۂ پاکستان کا مقصد

اب آیئے اس حقیقت کی طرف کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائداعظمؒ اور مخالفینِ مطالبۂ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؛ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفینِ پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا ——

قائداعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی، نے ایوانِ اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا:-

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد، معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۵ر ۹ر ۱۹۴۰ء)

---

[۲] اس وقت میرے سامنے طلوعِ اسلام اپریل مئی ۱۹۴۲ء کا شمارہ ہے جس میں پہلی بار یہ انٹرویو شائع ہوا تھا۔

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:۔

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، ۲۹-۱۱-۱۴)

۱۹۴۰ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:۔

اگر مذہب کو علیحدہ رہنے دیا جائے یعنی ایک سچ کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز، ۴۰-۶-۹)

اسی رو میں مسٹر گاندھی نے ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا:۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن، ۱۹۴۶-۱۲-۹)

مسٹر گاندھی کا یہ ردِ عمل، قائدِ اعظمؒ کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اوّل الذکر کو یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا:۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے، لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے۔ اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا، مذہب اور سیاست، دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۴۰-۱۳۹)

قرآنِ مجید کی عظمت

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآنِ عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآنِ مجید کی عظمت۔ اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا۔ وہ پوری تحریکِ پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِ اعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:۔

> تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۱۶)

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:۔

> جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۸)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی سوال اٹھایا۔

> وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں، وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا!

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی عظیم کتاب قرآنِ مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول۔ فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۵۱)

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہِ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:۔

> اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانتک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط

ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:-

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرّہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۱)

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس میں جب طلباء نے یہ سوال کیا کہ "مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟" تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:-

جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION[1]) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان، اور محاورے کی رُو سے، میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شد و مد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائدِ اعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

دشمنوں کی گواہی

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما،

---

[1] ہمارے ہاں وقتاً یہ بحث آجاتی ہے کہ قرآن کریم میں اسلام کے لئے دین کا لفظ آیا ہے اور لفظ دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔ ان کے ہاں صرف (RELIGION) کا لفظ ہے جس کے معنی مذہب ہیں، دین نہیں۔

مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:-

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے۔ اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون ۔ ۱۹۴۱ - ۱۱ - ۲)

ضمناً۔ اوائل ۱۹۷۷ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام، قائدِ اعظمؒ کے جشنِ صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر، پروفیسر ڈاکٹر (KRAHNAN) نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:-

قائدِ اعظم محمد علی کے سامنے ماڈل، قرآنِ مجید تھا۔

(پاکستان ٹائمز، ۳ فروری ۱۹۷۷ء)

یعنی بھارت کے مسٹر منشی اور جرمنی کے سکالر تک تو جانتے تھے کہ قائدِ اعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب!

بوٹا بوٹا پتہ پتہ، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالہ، افتتاحیہ میں لکھا تھا:-

پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصولوں روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اس مقالہ، افتتاحیہ میں کہا:-

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائدِ اعظمؒ اور مخالفین میں باعثِ نزاع کیا مسئلہ تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائدِ اعظمؒ اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کر لے گا۔

قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سرِفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان کی بناءِ مخالفت سامنے آجائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائدِاعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟ یہ مخالف علماء (باستثنائے چند) دارالعلوم دیوبند کے مسلک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسلک کیا تھا، اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی سترہ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:-

> یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماءِ ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ ایک مثال ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ حضرات سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائدِاعظمؒ اس طرزِ حکومت کے مخالف۔ اور یہی ان دونوں میں بناءِ مخاصمت تھی۔ سیکولر نظامِ حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہلِ مذہب کو اعتقادات، عبادات، رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو۔ اور امورِ مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے داعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اُس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیت العلماء ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کا ارشاد تھا:-

> ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت ہے؟
>
> (زمزم، مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء)

وہ فرماتے تھے:-

> کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔
>
> (مولانا مدنی کا پمفلٹ۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ ص۱۱)

اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قائدِاعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام میں مملکت کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے، اس لئے ان علماء کا یہ مسلک اسلام کے خلاف ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قائدِاعظمؒ اور ان علماء کے اختلاف کی شدت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیدیا تھا۔ اس فتویٰ کا جواب (مولانا) شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا۔ (رہبرِ دکن" ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر

اب آیئے قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی طرف، جسے یہ حضرات تُرپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر صاحب نے بھی اپنے دعوے کی بنیاد رکھی ہے، اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصوّر کی نفی کر دی تھی، بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیمِ ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائدِ اعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلسِ آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں صورتِ حال اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مؤرخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنا بریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:-

> تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں، تمہاری ذات یا ملک کچھ بھی ہو، اس کا امورِ مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں ——— رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ——— میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے، اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، رفتہ رفتہ ان منافشات کو مٹا دیا۔ اور "اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں"۔

اسی طرح :-

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان ـــــ مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریکِ پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے سدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ وہ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت، کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا :-

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک، ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے جب مجلسِ آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ (جیسا کہ محترم جسٹس نے خود اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں، مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات اُبھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اُچھالا گیا۔ اور تو اور، دِلّی سے جو گاڑیاں خود

حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں۔ (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِعمل پاکستان کے بعض حصّوں میں بھی ہوا۔ اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی، اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو، اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہوگی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے، اور دوسری طرف انہیں استحصال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائدِ اعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائدِ اعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اُس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آپڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رُو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائدِ اعظمؒ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟.... مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے۔ (ان کا چند سال ... ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا، (RATIONALE OF PAKISTAN CONSTITUTION) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی رُو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی:-

۱۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور

۲۔ اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

اقلیتوں کے لئے تحفظات

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء) کی تقریر کے اقتباسات دیکر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویّہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان، مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے —— جو خود اس پاکستان کے خالق تھے —— اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظِ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد

اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائدِ اعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے، آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہی ہو سکتی ہے۔ حُسنِ اتفاق کہ قائدِ اعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں، اہلِ امریکہ کے نام جو پیغام براڈکاسٹ کیا تھا۔ اس کا ایک حصّہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس کے شروع میں کہا تھا:۔

> مملکتِ پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے' ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۳)

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ محترم جسٹس منیر صاحب نے جس طرح اس براڈکاسٹ کا وہ حصّہ حذف کر دیا تھا جس میں قائدِ اعظمؒ نے بتایا تھا کہ تھیا کریسی کسے کہتے ہیں اسی طرح انہوں نے اس براڈکاسٹ کا جو اقتباس

اپنی کتاب میں دیا ہے (صفحہ ۳۱-۳۰) اس میں اسلامک سٹیٹ کے الفاظ بھی درج نہیں کئے کیونکہ یہ اُن کے دعویٰ کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتے تھے۔

انہوں نے اسی ماہ (فروری ۱۹۴۸ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈکاسٹ میں فرمایا تھا:-

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھریگا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دونگا جو یہ ہے:-

ایسا تمہارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان مستقبل پر۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں، اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریمِ ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے اسالیبِ فکر، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل - صفحہ ۵۸)

اگر ہم مملکت پاکستان کی بنیاد قرآنِ مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کے رشتہ سے اُمتِ واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصوّر کو عام ہونے دیا اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

ایمان، ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔ یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر (بصد تاسف) کہنا پڑتا ہے کہ محترم منیر صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقریر کا جو اقتباس دیا ہے (صفحہ ۳۱) اس میں وہ حصہ نقل نہیں کیا جس میں ایمان کا ذکر ہے۔ قائداعظمؒ نے ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:-

ہم مسلمان، ایک خدا، ایک کتاب (قرآنِ مجید) اور ایک رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ کھڑے ہونا ہوگا۔ (تقاریر گورنر جنرل - صفحہ ۱۲۶)

انہوں نے ۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

میرے پیشِ نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقننِ اعظم حضور نبی کریمؐ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیئے۔

(تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۵۶)

تقسیم ہند کے عواقب میں، جب انگریز، ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی۔ عین اس حالت میں آپ نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بڑھایا اور کہا کہ یاد رکھو!

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں، ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخر الامر فتح ہماری ہی ہو گی۔

(تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۳۰)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ ایک سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہوں ——— لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جاتے جاتے البتہ، ایک اور تاسف کا اظہار بھی ناگزیر ہے۔ محترم جسٹس فرماتے ہیں کہ:

قائدِ اعظمؒ نے آئیڈیالوجی آف پاکستان (نظریۂ پاکستان) کے الفاظ کبھی استعمال نہیں کئے تھے۔

تشکیلِ پاکستان کے پندرہ سال بعد تک بھی کوئی شخص ان الفاظ سے واقف نہیں تھا۔ (صفحہ ۳۵)

قائدِ اعظمؒ پاکستان کے اسلامک سٹیٹ ہونے کے متعلق جو کچھ دس سال تک کہتے رہے اس کے بعد اس کی چنداں اہمیت نہیں رہتی کہ انہوں نے اس خاص اصطلاح نظریۂ پاکستان کو استعمال کیا تھا یا نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کو بھی استعمال کیا تھا مثلاً انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندہ کو ۸ر نومبر ۱۹۴۵ء کو انٹرویو دیتے ہوئے جہاں یہ کہا کہ،

پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہو گی۔

وہاں نظریۂ پاکستان (THEORY OF PAKISTAN) کے الفاظ بھی استعمال کئے تھے۔

(تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۷-۳۲۶)

پھر انہوں نے ۱۸ر جون ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا تھا:-

پاکستان سے صرف حریت اور آزادی مراد نہیں۔ اس سے فی الحقیقت مراد "مسلم آئیڈیالوجی" ہے جس کا تحفظ ضروری ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۶۳)

علاوہ ازیں انہوں نے اسلامک آئیڈیلز قسم کے الفاظ متعدد بار استعمال کئے تھے۔ باقی رہا تشکیلِ

پاکستان کے بعد پندرہ سال کا عرصہ، تو اگرچہ اس سوال کا قائدِ اعظمؒ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر کوئی دیکھنا چاہے تو کم از کم طلوعِ اسلام کے فائل ہی دیکھ لے جس میں "اسلامی آئیڈیالوجی (نظریۂ پاکستان) پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

—— (۰) ——

جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں، ان تصریحات سے میرا مقصد اس نقصان کے ازالہ کی حسبِ استطاعت کوشش ہے جو پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے خلاف اس قسم کے پروپیگنڈا کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ تنہا اور نحیف سی آواز اس شور و شغب کی کماحقہٗ حریف نہیں ہو سکتی جو اس مقصد کے لیے ملک کے گوشے گوشے میں برپا کیا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے تو بہر حال اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ یہ پراپیگنڈہ کتنے وسیع پیمانے پر عام کیا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایک خط سے لگائیے جو حال ہی میں مجھے طلوعِ اسلام کے ایک قاری کی طرف سے موصول ہوا ہے:۔

ہفتہ وار الفتح کراچی۔ شمارہ ۲۸ ستمبر (۱۸-۱۱) سنہ ۱۹۸۰ء میں صفحہ ۲ پر ایک مراسلہ زیرِ عنوان ——— قائدِ اعظمؒ کیسا نظامِ حکومت چاہتے تھے ——— نظر سے گزرا۔ اس کی نقل بعینہٖ درج ذیل ہے:۔

ممتاز سیاسی رہنما عبدالرحمٰن صدیقی (مرحوم) ناقل ہیں کہ "تقسیم سے چند روز قبل نئی دہلی نمبر ۱ اورنگ زیب روڈ کا واقعہ ہے کہ ڈنر کی میز پر راجہ صاحب (محمود آباد) نے قائدِ اعظمؒ سے دریافت کیا۔ "پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہوگا؟" قائدِ اعظمؒ نے پوچھا۔ آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیئے؟ راجہ صاحب نے جواب دیا۔ اسلامی اور ملت کا سب سے زیادہ دیندار، متقی، عالم باعمل، صالح ترین شخص کو ہمیشہ ملک کا سربراہ بنایا جائے۔"

قائدِ اعظمؒ نے کہا۔ "تم بیسویں صدی میں قرونِ وسطیٰ کے حالات کا تصور کر رہے ہو، پاکستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہوگی۔"

راجہ صاحب بولے۔ "سر! ہم نے اتنے برس مسلم لیگ کی جدوجہد محض ایک اسلامی مملکت اور اسلامی آئین کے نصب العین کو سامنے رکھ کر کی تھی۔" "کون سے اسلام کا؟ اسلام میں بہتّر فرقے ہیں۔" قائدِ اعظمؒ نے دریافت کیا۔ راجہ صاحب خاموش ہو گئے۔

(کارِ جہاں دراز ہے۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۷۱-۲۷۲۔ از قرۃ العین حیدر)

اس وقت نہ عبدالرحمٰن صدیقی دنیا میں موجود ہیں، نہ راجہ صاحب محمود آباد، اور نہ قائدِ اعظمؒ۔ محترمہ قرۃ العین حیدر بھارت فرار ہو چکی ہیں۔ اور وہاں جا کر انہوں نے لکھا تھا کہ وہ خود دو قومی نظریے پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اب فرمائیے کہ ہمارے پاس ڈنر کے میز پر اس ٹیبل ٹاک کی تصدیق کا کونسا ذریعہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ ہی اس قسم کی روایات کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے شروع میں کہا تھا کہ قائدِ اعظمؒ (یا کسی اور) کی طرف اُن کی صرف ان باتوں کو منسوب کرنا چاہیئے جو ان کی زندگی میں محفوظ ہو گئی ہوں۔ اس قسم کی

وضعی روایات ہی نے تو ہمیں برباد کیا ہے۔ مندرجہ بالا ایک روایت، ان تمام مجلدات کو غرقاب کر دینے کے لئے کافی ہے جو قائدِ اعظمؒ کی تقاریر، بیانات، خطابات، سے بھرپور ہیں۔ افسانہ ہمیشہ حقیقت سے زیادہ دلکش اور مؤثر ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید نے تیس پاروں میں اپنی جامع تعلیمات کو مکمل کرنے کے بعد، جن الفاظ پر اس کتابِ عظیم کا اختتام کیا ہے، وہ وسوسہ انگیزی کے شر سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ (مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۱۱۴/۴) افسانے وسوسہ انگیزی کا بڑا کامیاب حربہ ہوتے ہیں۔ ان سے افراد نہیں قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے بتیس سال سے افسانہ طرازی کی یہ کوششیں جاری ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے محرکات سب معاشی تھے۔ کراچی کے ایک پروفیسر قمرالدین خان صاحب دس قدم آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسلامی مملکت یا سیاسی نظام کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ اور انبیاء کرامؑ صرف پرستش کے طور طریقے سکھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے مرے سے ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔ (ان کا یہ مقالہ روزنامہ ڈان کے اس ضمیمہ میں چھپا تھا جو اگست ۱۹۸۰ء کے یوم آزادی کی تقریب پر شائع ہوا تھا) انہوں نے سارا قصہ ہی ختم کر دیا۔

یہ ہے وہ پراپیگنڈہ جو آج کل بڑی شدّ و مد سے جاری ہے۔ ہم اس بات میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ اس خطۂ زمین کو اپنی حفاظت میں رکھے جسے ہم نے "مسجد" تعمیر کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس پر ابھی تک "مسجد" تعمیر نہیں ہو سکی۔ اور جنہوں نے اس کی تعمیر کے لئے اس خطہ کے حصول کے لئے تگ و تاز کی تھی، (اور ان میں سے جو اس کے غبارِ کارواں کی طرح "ہنوز زندہ ہیں) وہ اپنے اسی حسین خواب کی تعبیر کے انتظار کے سہارے جی رہے ہیں۔ لیکن اگر (خدانہ کرے) یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو "تعمیرِ مسجد" کا امکان ہی ختم ہو جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری! اور یہی ان پاکستان دشمن کوششوں کا مقصود ہے۔

(۰)

یہاں تک میرا یہ مقالہ روزنامہ "نوائے وقت" کی اشاعت بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس میں یہ عبارت تھی:۔

> آخر میں ایک درخواست جسٹس محمد منیر صاحب سے بھی ہے۔ یوں تو زندگی خدا لی دین ہے اور وہ جس وقت چاہے اٹھا لے تاہم انسان کی ایک عمرِ طبعی بھی ہوتی ہے۔ نہایت دلسوزی سے عرض ہے کہ جسٹس صاحب جن کی عمر طبعی بہر طور گزر چکی ہے اور وہ کسی بھی وقت خدا کے حضور میں پیش ہو سکتے ہیں، اگر مناسب سمجھیں تو اپنی اس غلطی کا ازالہ کر سکتے ہیں اور اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں تو پاکستان کے محرکات کے بارے میں اپنی ذاتی سوچ سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔ توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے مگر کسی بھی وقت ان کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی بند ہو سکتا ہے۔

میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ میرے نہیں۔ نوائے وقت نے سرے سے علم اور اطلاع

کے بغیر یہ اضافہ اپنی طرف سے کر دیا اور اس کی تصریح بھی نہیں کی۔۔۔ یہ آدابِ صحافت کے خلاف تھا۔ محترم منیر صاحب اگر سیکولر سٹیٹ کے حق میں ہیں تو یہ ان کا ذاتی خیال ہے۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں اتنا ہی کہوں گا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس خیال کو قائداعظمؒ کی طرف منسوب کیا ہے، جو حقیقت کے خلاف ہے۔ میرا مقصد ان کے اس الزام کی تردید اور احقاقِ حق تھا جسے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران بھی یہ موضوع زیرِ بحث رہا تھا۔ وہاں نیشنلسٹ علماء کا گروہ تھا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ سیکولر سٹیٹ عین مطابق اسلام ہے۔ میں نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان کی مخالفت کی اور قرآنی دلائل اور صدرِ اسلام کے شواہد سے ثابت کیا کہ سیکولرازم اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی ان حضرات کی طرف سے اسلام کے خلاف جو الزام عائد کیا جاتا تھا میں نے اس کی تردید کی تھی۔ اور اسے میں اپنا فریضہ سمجھتا تھا، اور آج بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہوں (اور اس کی سزا بھی بھگت رہا ہوں) میں نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا تھا، ۱۹۸۳ء میں بھی وہی کہتا ہوں کیونکہ یہ قرآنی حقائق پر مبنی ہے، اور قرآنی حقائق ابدی، اور غیر متبدل ہیں ———— قرآن کو سند اور حجت ماننے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ آج کچھ کہہ دے اور کل کچھ اور۔ قرآن کا متبع نہ مداہنت کر سکتا ہے نہ کسی سے مفاہمت۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش　　میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند　　(بالِ جبریل)

(۵)

نوائے وقت میں میرا مقالہ شائع ہونے کے بعد، مجھے، ملک اور بیرونِ ملک کے دور دراز گوشوں سے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جن حقائق کا میں نے انکشاف کیا ہے وہ ان کے علم میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ملک کے ذرائع ابلاغ (پریس) نے میرے خیالات کے گرد جو حصار کھینچ رکھا ہے، اس مقالہ کی نوائے وقت میں اشاعت سے اس میں شگاف پڑا اور اس طرح میرے خیالات، طلوعِ اسلام کے حلقہ سے باہر، دور دراز خطوں تک پہنچ گئے۔ اس کے لئے میں 'نوائے وقت' کا بھی شکر گزار ہوں اور جن حضرات کی طرف سے مجھے یہ خطوط موصول ہوئے ہیں، ان کا بھی۔ ان خطوط میں ایک مطالبہ بطورِ قدرِ مشترک سامنے آتا ہے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ میں ذرا وضاحت سے بتاؤں کہ تھیاکریسی، سیکولرازم اور اسلامی مملکت میں کیا فرق ہے؟ میں ان موضوعات پر (پاکستان میں) گذشتہ تیس سال سے لکھتا چلا آ رہا ہوں لیکن چونکہ یہ مطالبہ ان گوشوں سے موصول ہوا ہے جن تک (غالباً) اس سے پہلے میرے خیالات نہیں پہنچے اس لئے

میں مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

تھیاکریسی کا تصور تو پرانا ہے لیکن اسے بطورِ نظامِ حکومت، عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروّجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبۂ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتا کیا کہ احکام و قوانین کلیسا (چرچ) وضع کرے لیکن وہ، نافذ حکومت کی طرف سے ہوں۔ اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام و قوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعتِ خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف، مذہبی پیشوائیت کے جذبۂ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف، حکمرانوں کو مقبولیتِ عامہ حاصل ہو گئی، کیونکہ عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظ ان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام و تقدیس کے حامل (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج (DEFENDER OF THE FAITH) کہہ کر پکارا جاتا ہے)۔

مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیاکریسی (یعنی حکومتِ خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظامِ حکومت میں انسانیت ظلم و استبداد کے جس جہنم میں مبتلا رہی، اس کے تصور تک سے (ہمارا بھائی آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز خان تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی تاریخ میں، تھیاکریسی سے بدتر دور کبھی نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خان کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں۔ لیکن جو ظلم و تشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں، فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیاکریسی سے مراد ہے ایسا نظامِ حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جائے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالہ دار و رسن کر دیا جائے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیاکریسی کے خلاف جو ردِّعمل ہوا اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب کا دائرہ، گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات، قوم کی منشا کے مطابق، کسی قسم کی حدود و قیود کے بغیر، آزادانہ طے پائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ، اخلاقی اقدار و اصول کی "صدری" کو بھی اتار کر دور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظامِ حکومت جس میں قانون سازی کے کھلے اختیارات، کسی قسم کی حدود و شرائط کے بغیر، قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ نظامِ حکومت (کم و بیش) ساری دنیا میں رائج ہے۔ (اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں بھی ہے)۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے دیکھا کہ اس ملک کے باشندے سخت قسم کے مذہب پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ یہاں یورپ کی شکل کی سیکولرازم چل نہیں سکے گی۔ انہوں نے اس میں یہ ترمیم کی کہ قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک شخصی قوانین (PERSONAL - LAWS) اور دوسرے، ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) انہوں نے کہا کہ شخصی قوانین کی حد تک

ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق ان کا اتباع کرے۔ لیکن پبلک لاز میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہوگا یعنی انہوں نے، پرسنل لاز کی حد تک، تھیاکریسی رائج کر دی اور پبلک لاز کے لئے سیکولرازم۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ نے اسے مذہبی آزادی سے تعبیر کیا اور اس کے لئے سلطنتِ انگلشیہ کا بے حد شکر گذار ہوا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، یہی متفقہ (ہندوؤں اور) نیشنلسٹ علماء کا تھا۔ اور اسی کو ساتھ لے کر وہ پاکستان آئے۔ ان کے برعکس، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے اسلامی مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا۔

اسلامی مملکت میں حقِ حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں کو۔ یعنی وہ تھیاکریسی۔ سیکولرازم۔ یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیاکریسی + سیکولرازم، سب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس میں حقِ حکومت خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں وہ اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (اُمت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جزئی قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔ ان میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق اور تمیز نہیں ہوتی۔ پبلک لاز کی طرح ان سب کا اطلاق ملک کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے اور قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ کہہ لیجئے) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اسے بھی اُمت، باہمی مشورہ سے (مندرجہ بالا شرط کے تحت) خود طے کرے گی۔

یہ ہیں اسلامی مملکت کے نمایاں خط و خال۔ قرآنِ کریم نے یہ نصِ صریح کہہ دیا ہے کہ اس کے سوا جو نظامِ حکومت بھی ہے، وہ کافرانہ نظام ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ جو چیز اسلامی نظامِ مملکت کو غیر اسلامی نظام سے متمیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصول و اقدارِ خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزل من اللہ ہوتے ہیں اور ابدی اور غیر متبدل۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے اصول و قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوگئے۔ اب ان میں کوئی انفرادی تبدیلی نہیں کر سکتا۔" (نیز ۶/۳۴ ، ۱۸/۲۷)۔ سورۂ یونس میں ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴) "قوانین و حدودِ خداوندی میں تغیر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔" اس کے برعکس دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو، خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہی بنیادی تخصیص، اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں مابہ الامتیاز ہے (سیکولر نظام کے حامیوں کی طرح) جسٹس منیر صاحب، غیر متبدل اصول و حدود کو نہیں مانتے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۵ء کے پاکستان ٹائمز میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا:-

قانونِ تغیر ایک فطری اصول ہے جو تمام کائنات کو محیط ہے۔ ایک ذرۂ ناچیز سے لے کر بڑے سے بڑے کرۂ فلکی تک، حرکت اور تغیر کی حالت میں مستقلاً سرگرداں ہیں۔ ہم بھی جو اس عظیم کائنات کے ایک ذرا سے گوشے کے مکین ہیں، اسی

قانونِ تغیّر کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کرتے ہیں۔ (ہمارے) اس بیان کی صداقت کے لئے آپ گذشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ شیکسپیئر نے کہا تھا "خیر اور شر فی ذاتہٖ کچھ نہیں۔ یہ ہمارا زاویۂ نگاہ ہے جو کسی بات کو خیر قرار دیتا ہے، کسی کو شر۔ (جیسا ہم خیال کریں وہ شے ویسی ہی ہو جاتی ہے)۔ حق اور باطل، غلط اور صحیح ——— قانون نہیں بلکہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ——— اضافی ہیں۔ اسی طرح خیر اور شر بھی۔ انسان کا تصورِ حق و باطل اور خیر و شر سوسائٹی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسے اس بات کا فیصلہ کہ فحش اور بے حیائی کیا ہے، سوسائٹی کے معیار کی رُو سے ہوتا ہے۔ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ——— بجز اس کے کہ کوئی بڑی مہیب قوت اسے روکے رکھے ——— اور جس سوسائٹی اور مملکت میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تغیرات کو نگاہ میں رکھے۔ مذہب پرست طبقہ البتہ غیر متبدل اقدار پر ایمان رکھتا ہے۔

طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۵ء میں اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا تھا۔

"یہ خیالات اسلام کے پیش کردہ تصورِ حیات کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ (اسلام تو ایک طرف) نظامِ فطرت کے متعلق بھی محترم مقالہ نگار کی معلومات بھی بڑی سطحی اور ناقص ہیں۔ وہ اگر کسی عام سائنس دان سے بھی پوچھ لیتے تو وہ بتا دیتا کہ یہ کارگہ کائنات، فطرت کے غیر متبدل قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہے، اور تغیرات صرف ان قوانین کے مظاہر ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ سرما میں وہ بالکل ٹھنٹھ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بہار آتی ہے تو ان میں شگفتہ و شاداب تازہ پتیاں اُبھرتی ہیں۔ غنچے چٹکتے ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پھل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قانونِ نشوونما کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر ان قوانینِ فطرت میں، جس کی بنیادوں پر اس محیر العقول کارگہ کائنات کی عمارت استوار ہے، ذرا سا تغیر بھی آ جائے تو سارا سلسلہ کائنات تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ خود منیر صاحب اپنی طبعی زندگی پر غور فرمائیں۔ زندگی کا مدار تنفس (سانس لینے) کے قانون پر ہے۔ کیا ان کی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس قانونِ حیات میں تغیر واقع ہوا ہے؟ وہ غالباً اسے "تغیر" سمجھتے ہیں کہ کام حالات میں انسان از خود فضا میں سانس لیتا ہے یا سمندر کی تہ میں، یا چاند کی سطح پر، اسے آکسیجن کا بیگ اپنی کمر پر لادنا پڑتا ہے، اور مریض کو آکسیجن ٹینٹ میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہ قانونِ زندگی کے تغیرات نہیں، یہ اس قانون پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع و اسباب ہیں۔ ذرائع و اسباب حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ قانون ہمیشہ غیر متبدل رہے گا ——— یہ ہے نظامِ فطرت۔

انسان کی تمدنی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کے لئے بھی قوانین کی ضرورت ہے۔ یہ قوانین (جو وحی کے ذریعے عطا ہوتے ہیں) غیر متبدل رہتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے اسباب و ذرائع بدلتے رہتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قوانین خیر و شر اور حق و باطل کا معیار ہیں۔ منیر صاحب اپنے دعویٰ کی تائید میں شیکسپیئر کا قول پیش کرتے ہیں، اور اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ——— قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں۔" مذہب پرستوں" کا خدا کے اس ارشاد پر ایمان ہے جس کی تائید کائنات کا سارا نظامِ فطرت کر رہا ہے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منیر صاحب اپنے دعویٰ کی تائید میں، علامہ اقبالؒ کو بھی پیش فرما رہے ہیں۔ لیکن اسی طرح جس طرح انہوں نے نظامِ فطرت کو اپنی تائید میں پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مندرجہ بالا دعوے کے بعد خطباتِ اقبالؒ

سے، حسبِ ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر مشتمل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔

منیر صاحب نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں (کہ انسان کی تمدنی زندگی میں غیر متبدل کا کوئی تصور نہیں) علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا بیان پیش فرمایا ہے۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ

سخن شناس نۂ، دلبرا! خطا اینجاست

جس طرح وہ نظامِ فطرت کے متعلق اتنا نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس میں کس قدر غیر متبدل قوانین کارفرما ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ اقبالؒ کا بیان ان کی تائید نہیں کر رہا، تردید کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ، ثبات و تغیر کے امتزاج کو اصولِ حیات قرار دے رہے ہیں۔ وہ غیر متبدل قوانین کو وہ سہارا قرار دیتے ہیں جس پر انسانی زندگی کا قیام ہے لیکن جس طرح محترم جسٹس منیر نے قائدِ اعظمؒ کے بیانات نقل کرتے ہوئے، ان کے ان حصوں کو حذف کر دیا تھا جو ان کے خلاف جاتے تھے، اسی طرح انہوں نے خطباتِ اقبالؒ میں سے صرف مندرجہ بالا اقتباس درج کیا تھا اور اس سے اگلی سطریں حذف کر دی تھیں، کیونکہ وہ بدیہی طور پر ان کے مسلک کی تردید کرتی تھیں۔ علامہ نے لکھا تھا:۔

یورپ کو اپنی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں، اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں سیکولرازم اور مقیاکریسی دونوں کا ابطال کر دیا ہے۔ سیکولرازم کا یہ کہہ کر کہ یورپ کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس غیر متبدل اصولِ حیات نہیں، اور مقیاکریسی کا یہ کہہ کر کہ مسلمانوں نے صدیوں پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر انہیں مقامِ الوہیت عطا کر رکھا ہے۔ یہ دونوں مسالک خلافِ اسلام ہیں اور قوموں کی تباہی کا موجب۔

جسٹس منیر نے سیکولرازم کے اپنے عقیدہ کی تائید میں پہلے قائدِ اعظمؒ کا سہارا لینا چاہا اور اس میں ناکام رہے۔ پھر علامہ اقبالؒ کو ساتھ ملانا چاہا تو وہ بھی جواب دے گئے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۱۶/۳۷) جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کر لے، اسے کوئی حامی و ناصر نہیں مل سکتا۔

والسلام

اضافہ

جسٹس منیر (مرحوم) سے متعلق جو مقالہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا وہ اختتام پذیر ہوا۔ انہوں نے جو اعتراضات کئے تھے وہ افسوسناک ضرور تھے لیکن اب جو شکوک پیدا کئے جا رہے ہیں وہ نہ صرف افسوس ناک ہیں بلکہ حیرت انگیز بھی ہیں۔ یہ شکوک اُن لوگوں کی طرف سے پیدا کئے جا رہے ہیں جو ساری عمر مسلم لیگ کے ساتھ رہے اور جنہیں قائداعظمؒ کے رفقاء کی صف میں شامل ہونے کا دعویٰ بھی ہے۔ قائداعظمؒ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان نہیں تھے جو یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے خیالات کیا تھے اور مقاصد کیا۔ ان کی تقاریر، بیانات، مذاکرات، انٹرویوز وغیرہ۔ (جو ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں) ان کی زندگی میں چھپ چکے تھے اور ہر جگہ دستیاب ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، یا تو انتہائی بے خبری کی دلیل ہے یا عمداً کتمانِ حقیقت جو جرمِ شنیع ہے۔ گذشتہ اوراق میں جو شواہد پیش کئے گئے ہیں، وہ قائداعظمؒ کے اپنے خیالات پر مشتمل ہیں۔ جو مزید شواہد اب پیش کئے جائیں گے وہ بھی انہی کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات ہیں جن کے مستند حوالے ساتھ کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ آپ ان کا غور سے مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ یہ کہنا کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، ان کے خلاف کتنا بڑا اتہام ہے۔

ہم سب سے پہلی شہادت قائداعظمؒ کے ان مخالفین کی طرف سے پیش کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران ان کی اور ان کے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ یعنی (کالعدم) جماعتِ اسلامی اور اس کے مرحوم امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی اس جماعت کے ترجمان ہفت روزہ (الجمعیۃ) نے اپنی ۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں آمنے سامنے کے دو صفحات پر الگ الگ چوکھٹوں میں قائداعظمؒ کے مختلف مواقع پر ارشادات کے اقتباسات دیئے تھے ان میں ایک اقتباس حسبِ ذیل تھا۔

> ہمارے ملک میں اس وقت دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک طبقہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کا حامی ہے اور دوسرا طبقہ پاکستان میں روایتی اسلام کا نظام برپا کرنا چاہتا ہے میں ذاتی طور پر صحیح اسلامی نظام کا دیانتداری سے خواہشمند ہوں۔ پاکستان کے علاقوں میں ہم اس قابل ہوں گے کہ اسلام کے ترکے اور اپنے تہذیب و تمدن کی نگہبانی دوسروں کی مداخلت کے بغیر کر سکیں۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری ۵۹ء، ص ۶۹)

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ یہی دونوں طبقے اب پاکستان میں مؤثر ہو رہے ہیں۔ سیکولر ریاست کی آوازیں خود قائداعظمؒ کے (مبینہ) رفقاء کی طرف سے اٹھ رہی ہیں اور روایتی اسلام کی علمبردار (کالعدم) جماعتِ اسلامی ہے جس کے (مرحوم) امیر مودودی صاحب نے تجویز کیا تھا کہ پاکستان میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ بہرحال اب زیرِ نظر موضوع کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

(۲) یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ کوئی کہتا ہے کہ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری تھی۔ کہیں سے آواز بلند ہوتی ہے کہ اس کا جذبہ محرکہ معاشی تھا۔ کوئی کہتا ہے یہ انگریز کی سکیم تھی۔ دیکھئے کہ خود قائداعظمؒ اس باب میں کیا کہتے تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریز کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔ (کتابچہ "قائداعظمؒ کا پیغام" مرتبہ سید قاسم محمود صفحہ ۵۲)

(۳) انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہاں وہ اپنے ضابطۂ حیات، اپنی ثقافتی نشو و نما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۳)

(۴) انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ (دہلی) کے اجلاس منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کے صدارتی خطاب کے دوران فرمایا۔

ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ بہت سے فتنے برپا کئے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ جاتا ہے کہ کیا پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آسکے؟

(تقاریر جناحؒ جلد اول صفحہ ۵۵۵)

اس زمانے میں اس قسم کی غلط فہمیاں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی طرف سے بالخصوص پھیلائی جاتی تھیں۔

(۵) انہوں نے حیدرآباد (دکن) کے ایک جلسہ عام میں، ۱۱ جولائی ۱۹۴۶ء کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

اس وقت میدانِ سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اس میں کون فتحیاب ہوگا۔ علم غیب تو خدا کو ہے لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات و استقامت پہ کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت، یا طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔

(کتابچہ "قائداعظمؒ اور طلوعِ اسلام" صفحہ ۲۶)

(۶) انہوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

اگر آپ یہ نہیں چاہتے کہ اس ملک سے اسلام مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف ایک عملی نصب العین ہے بلکہ واحد نصب العین ہے۔ (تقاریر جناحؒ جلد اول صفحہ ۲۶۴)

(۷) انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (لاہور) کی سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔
پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد، دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ایک ایسی مملکت قائم ہوئی ہے جو اسلام کی عظمتِ گذشتہ کو دوبارہ زندہ کر دے گی ..... یاد رکھئے! اسلام ہی ہمارا بنیاد کا پتھر اور ہماری کشتی کا لنگر ہے۔ (تقاریر، جلد دوم ص۸۹-۸۵)

(۸) کالعدم جماعتِ اسلامی کے ترجمان۔ ایشیا (کی ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت) میں شائع شدہ ایک اقتباس پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں دوسرا اقتباس یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔
اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میں دنیا کو دکھا دوں گا کہ پاکستان اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ساری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ہے .... پاکستان ایک تحریک کا نام ہے جس کا مقصد پاکستان کے مرکز سے اسلامی نظریہ حیات کا فروغ اور اشاعت ہے۔ (طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۵۹ء-۶۹)

(۹) علامہ شبیر احمد عثمانی (علیہ الرحمۃ)

طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۸۳ء میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی وہ معرکہ آرا تقریر شائع ہوئی ہے جو انہوں نے پاکستان کی مجلسِ قوانین ساز میں قرار دادِ مقاصد پیش کرتے ہوئے، ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو فرمائی تھی۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔
قائدِ اعظم نے ۱۹۴۳ء میں بمقام جالندھر، آل انڈیا (مسلم) سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے قرآن کریم نے فیصلہ کر دیا تھا (ص۲۳)
اس کے بعد انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا:۔
قائدِ اعظمؒ نے نومبر ۱۹۴۵ء میں پیر صاحب مانکی شریف کے نام جو خط لکھا تھا اس میں صاف صاف کہہ دیا تھا "اس بات کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ نہ تو قانون بنانے والی جماعت جس میں بہت زیادہ اکثریت مسلمانوں کی ہوگی، پاکستان کے لئے ایسے قانون بنا سکے گی جو اسلامی قانون کے خلاف ہو اور نہ ہی پاکستانی غیر اسلامی قانون پر عمل کر سکیں گے"۔ اس قسم کے اعلانات قیامِ پاکستان سے پہلے قائدِ اعظمؒ اور دوسرے زعماء لیگ کی طرف سے برابر ہوتے رہے۔ (ص۲۳)

قیامِ پاکستان کے بعد:۔

بعض کینہ پرور دلوں کی جسارت اس حد تک بیباک ہو جاتی ہے کہ وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ جو اسلام اسلام پکارتے تھے تو وہ محض مقصد جیتنے کے لئے "وکیلانہ حربہ" تھا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد انہوں نے اسلام کا نام تک نہیں لیا تھا۔ اس سلسلہ میں قائدِ اعظمؒ کے چند ایک ارشادات سابقہ صفحات میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ان میں دو ایک کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ

تشکیلِ پاکستان کے لیے انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بہ حیثیت گورنر جنرل (پاکستان) کہا تھا۔ اس سے ان ارشادات کی ذمہ دارانہ حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔

(۱۰) انہوں نے (۳۰) اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم (لاہور) کی ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر ہم نے اپنا جذبہ محرکہ اور راہنمائی قرآن سے حاصل کئے تو میں ایک بار پھر کہوں گا کہ آخری جیت ہماری ہو گی۔ آپ کو، پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ (تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل صفحہ ۳۰)

(۱۱) انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا:۔

مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا دستور، اسلام کے بنیادی اصولوں پر حامل جمہوری انداز کا ہو گا۔ یہ اصول آج بھی عملی زندگی پر اسی طرح منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوئے تھے۔ (صفحہ ۶۵)

یہی الفاظ انہوں نے (۲۵) جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ (کتابچہ قائداعظمؒ کا پیغام صفحہ ۱)

(۱۲) انہوں نے (۱۳) جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج (پشاور) میں تقریر کے دوران فرمایا:۔

ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

(کتابچہ قائداعظمؒ کا پیغام۔ صفحہ ۹۹)

(۱۳) پھر انہوں نے اسی کالج کے طلباء سے (۱۲) اپریل سنہ ۱۹۴۸ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

یاد رکھو، ہم ایک ایسی مملکت تشکیل کر رہے ہیں جو تمام اسلامی دنیا کی تقدیر بدلنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ (تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل صفحہ ۱۱۲)

تمام اسلامی دنیا کی تقدیر بدلنے کے لئے!

ہم ان تمام اہلِ فریبوں سے جو قائداعظمؒ کے خلاف یہ بہتان تراشتے ہیں کہ وہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ قلم کے پورے زور کے ساتھ کہیں گے کہ قائداعظمؒ کے جو ارشادات درج کئے گئے ہیں، وہ یا انہیں جھوٹا ثابت کریں (جیسے وہ قیامت تک نہیں کر سکیں گے) اور یا پھر اپنے ایسے سنگین جرم کے لئے قائدِ اعظمؒ کی روح اور ملّتِ پاکستانیہ سے معافی مانگیں۔ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، نہ تھیاکریٹک (جیسا کہ اس وقت یہاں کہا جا رہا ہے) وہ اسے خالص قرآنک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔

آخر میں ہم اس مقدمہ کے تصفیہ کے لئے ایک ایسی شہادت پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے زیادہ ثقہ شہادت شاید ہی مل سکے۔ یہ شہادت ہے، شاہی مسجد (لاہور) کے سابق خطیب مولانا غلام مرشدؒ کی جن کا اسمِ گرامی زبان پہ آتے ہی، فضا میں زلزلہ سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جید عالم قرآن کے عشق میں گداز۔ اور حق گوئی و بیباکی کا مجسمہ۔ ان کی یہ شہادت، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۶ء کی زینت دہِ اوراق ہوئی تھی۔ اس سے ایک بار پھر، قلب میں حرکت اور جگر میں سوز پیدا کیجئے۔

مولانا غلام مرشدؒ کا مقالہ: (تمہید حذف کرنے کے بعد)

قائداعظم کا قرآنِ مجید کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا اور وہ اس باب میں کس قدر مخلص تھے، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں اس میں ایک ذاتی واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جسے میں نے اپنی شہادت کہہ کر پکارا ہے۔ سنہ ۱۹۴۵ء کے آخری ثلث کی بات ہے جب قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین کے ساتھ ممدوٹ ولا (لاہور) میں قیام فرما تھے۔

ایک دن جب میں اپنے مکان ——— چوہال نمبر ۱۰۵۱/H میں بیٹھا ہوا تھا، قائداعظمؒ کا ایک نمائندہ میرے پاس پہنچا اور کہا کہ قائداعظمؒ نے مجھ خاکسار کو فوری طور پر یاد فرمایا ہے۔ میں فوراً چلنے کے لئے تیار ہوا، لیکن پھر خیال آیا کہ ——— زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم ——— میں انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا اور قائداعظمؒ شاید میری زبان کو پوری طرح سمجھ نہ پائیں تو باہمی گفتگو کا نقشہ کیا ہوگا۔ اتفاق سے اس وقت میرے پاس مسٹر ایم مسعود کھدر پوش (سابق آئی سی ایس، جو اس زمانے میں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے) بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے ساتھ چلنے کے لئے کہا کہ وہ ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہم ممدوٹ ولا پہنچے تو قائداعظمؒ ایک چھوٹے سے کمرے میں، جس کا دروازہ بڑے ہال کی طرف بھی کھلتا تھا، میرے منتظر بیٹھے تھے۔ سلام مسنون کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک بڑے اہم دینی مقصد کے لئے بلایا ہے۔

جمعیت العلمائے ہند (دہلی) جس کے سرپرست مفتی کفایت اللہ (مرحوم) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسے نیشنلسٹ علماء، برسوں سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہیں، بہت سے علماء ہمارے ہم نوا بھی ہیں۔ لیکن ان کی کوئی تنظیم نہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ کوشش جاری تھی کہ ان علماء پر مشتمل ایک متوازی جمعیت قائم کی جائے۔ اس کا مرکز کلکتہ تجویز پایا اور مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں بھی قائم کر دی گئیں۔ اس کا افتتاحی اجلاس چند دنوں کے بعد کلکتہ میں ہونا قرار پایا۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں دعوت نامے بھی جاری کر دیئے اور مولانا راغب احسن (مرحوم) کے زیرِ سرکردگی جملہ انتظامات بھی مکمل کر لئے گئے۔ اس جمعیت کے نامزد صدر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کا افتتاح کرنا تھا کہ سوءِ اتفاق سے وہ دیوبند میں علیل ہو گئے ہیں۔ جمعیت کے اجلاس میں چند روز باقی ہیں۔ وہ اس میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے اپنے مخصوص "جرنیلی" انداز میں فرمایا کہ تم جلد از جلد خطبۂ افتتاحیہ تیار کرو اور ۲۵ اکتوبر تک کلکتہ پہنچ جاؤ۔ وہ ضابطے کے اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کہا کہ تم "شعبۂ عمومی سیاست" میں میرے نائب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرو اور اس ضروری دینی خدمت کو سرانجام دو۔ خاکسار نے ان کی اس سرفرازی پر شکریہ ادا کیا اور اس خدمت کو اپنا اہم ترین فریضہ سمجھ کر رخصت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو۔ جس شخص کے نائب بن کر تم وہاں جا رہے ہو اس کی پوزیشن کے متعلق چند بنیادی نکتے ذہن میں رکھ کر وہاں جاؤ۔ ان کے سامنے میز پر قرآنِ کریم کے انگریزی ترجمہ کا نسخہ رکھا تھا۔ اسے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ میرا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتابِ عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق مکمل ضابطے اور آئین موجود ہیں۔ تمدنی، معاشی اور اخلاقی، امنٹ اور دائمی قواعد موجود ہیں۔ عسکری تنظیم اور مملکت کے داخلی اور خارجی استحکام کے امنٹ قوانین موجود ہیں۔ لوگوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے ابدی ضوابط موجود ہیں۔ لیکن یہ قواعد اور ضوابط بالعموم اصولی حیثیت سے دیئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہوا جائے گا۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے قواعد و ضوابط مرتب اور نافذ کرے۔ مثال کے طور پر، انہوں نے کہا، قرآنِ کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس پر میں نے جرأت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ذہن میں غالباً قرآنِ کریم کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے: جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰) اس پر انہوں نے فوراً قرآنِ مجید کھولا اور اس آیت کو دیکھ کر فرمایا کہ بے شک یہی آیت میرے ذہن میں تھی۔ اس کے بعد کہا کہ دیکھو یہ ایک اصولی حکم ہے اور ابدی۔ یہ دیکھنا اسلامی مملکت کا کام ہوگا کہ معاشرہ کے عام حالات کی روشنی میں کس جرم کی سزا کیا ہونی چاہیئے جو قرآن کے اس اصول کے مطابق ہو۔ سب سے پہلے رسول اللہؐ نے یہ ضمنی قوانین مرتب فرمائے۔

اس پر میں نے پھر سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضورؐ نے ایسا کچھ خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کیا تھا جس کی رُو سے کہا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) انہوں نے پھر قرآنِ کریم کو کھولا اور اس آیت کو نکال کر کہا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اگر قرآنِ مجید کے اصولی احکام کے جزئی قوانین مرتب کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو مشاورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ کے بعد اُمت کو بھی اسی طرح تدوینِ قوانین کرنی ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے لئے بھی خدا کا حکم موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ انہوں نے پھر قرآنِ کریم سے یہ آیت نکالی اور کہا کہ خدا کی یہ ہدایت ہماری راہنمائی کے لئے کس قدر واضح ہے۔ اسلامی مملکت، جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں، کے آئین کی بنیاد یہی ہوگی۔

قائدِ اعظمؒ ان باتوں میں مصروف تھے اور کمرے کا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ کیونکہ مسلم لیگ

کے اراکین ضروری کارروائی کے لئے مضطرب بیٹھے تھے۔ اس پر میں نے اُٹھنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں تمہیں کچھ نظائر معلوم ہوں تو مثال کے طور پر مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں جنگ میں حاصل شدہ مال کے متعلق ایک اصولی حکم ہے کہ وہ مال "اللہ اور رسولؐ" کا ہوگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مختلف جنگوں میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کی تقسیم مختلف انداز سے ہوئی ——— جنگِ بدر کے خاتمہ پر ایک انداز سے، خیبر کے فتح کے ... بعد دوسرے انداز سے، جنگِ حنین اور ہوازن میں جو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو آپ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے وہ سارے کا سارا مال ان مجاہدین میں تقسیم کر دیا جو ابھی کچھ عرصہ سے فتح مکہ کے وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اس پر بعض گوشوں میں کچھ باتیں بھی ہونے لگیں لیکن جب حضورؐ نے اس کی مصلحت سمجھائی تو وہ بیک زبان پکار اٹھے کہ رضینا یا رسول اللہ ——— حضورؐ! ہم مطمئن ہیں۔

وہ ان تفصیلات کو بڑے جذب و انہماک سے سن رہے تھے۔ وہ اس گفتگو کے لئے زیادہ وقت دینا چاہتے تھے لیکن مسلم لیگ کی کارروائی کے اصرار پر انہیں اسے مختصر کرنا پڑا۔ میں اٹھا، تو فرمایا کہ جاتے جاتے ایک اور بنیادی نکتہ بھی ذہن میں لے کر جاؤ۔ کہا کہ میری نظر میں قرآنِ مجید کے فیصلے کے مطابق دو بدترین اور ناقابلِ معافی جرائم ہیں ——— ایک شرک اور دوسرا تفرقہ ——— تفرقہ خواہ مذہبی پیشواؤں کے نام پر، خواہ سیاسی راہنماؤں کے نام پر ہو، وطنیت کے نام پر ہو، رنگ نسل اور خون کے نام پر ہو، بہر حال جرمِ عظیم ہے۔ ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم (شرک) کی سزا اُخروی زندگی میں ملے گی۔ لیکن دوسرے جرم (تفرقہ) کی سزا اس دنیا میں ذلت و خواری، غلامی اور محکومی کی شکل میں ملے گی۔ اور آخرت میں اس سے بھی بدتر شکل میں، یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ——— ایک مومن اور دوسرے کافر ——— اسی کا نام دو قومی نظریہ ہے۔ مومنین کے اندر کسی بنیاد پر تفرقہ ناقابلِ معافی جرم قرار پائے گا۔ اس نکتے کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا۔ جاؤ خدا حافظ۔

میں رخصت ہو کر آیا تو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ یہ شخص جسے عام طور پر صرف ایک بیرسٹر سمجھا جاتا ہے اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں پر کتنی گہری نگاہ ہے۔ اور اس شخص کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں اسلامیت کی چھینٹ تک دکھائی نہیں دیتی، کتنا بڑا کذب و افترا ہے۔ میں نے حسبِ الارشاد خطبہ تیار کیا اور کلکتہ چلا گیا۔ ہم چار دن وہاں رہے لیکن کیفیت یہ تھی کہ قائدِ اعظمؒ جہاں بھی تھے ہم سے رابطہ قائم کئے رہے اور تفصیلات معلوم کرتے رہے ——— آخری اجلاس ختم ہونے سے پہلے ان کی طرف سے تنظیم کے متعلق بھی ضروری ہدایات موصول ہو گئیں اور قراردادوں کے سلسلے میں بھی۔

ان قراردادوں میں یہ کہا گیا تھا کہ:-

(۱) تحریکِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے جو قرآنِ مجید کا عطا فرمودہ غیر متبدل اصول ہے

(۲) اگر خدا نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی تو اس سرزمین میں حضور خاتم النبیینؐ کا

طرز پر حکومت قائم ہوگی، جس کا نام خلافت، علیٰ منہاجِ نبوت ہوگا۔ بالفاظِ دیگر اس حکومت کے ہر دائرے میں قرآنِ حکیم کی حکمرانی ہوگی۔

(۳) اکھنڈ بھارت کی سکیم کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا اور اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ (اور ان کے علاوہ کچھ تنظیمی قراردادیں) اس مردِ مومن کی ہدایات کے مطابق مرتب اور منظور کی گئیں جسے ایک گوشے سے "کافر اعظم" کہہ کر پکارا جاتا تھا اور دوسرے گوشے سے یہ آواز بلند کی جاتی تھی کہ اس کی اسکیم کے مطابق جو مملکت قائم ہوگی اس میں حکومت ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ کے پیشِ نظر سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد اس سرزمین کی سرحدوں کا تحفظ تھا۔ اور جن لوگوں کی آنکھوں پر حسد اور تعصب نے پٹی نہیں باندھ دی، انہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ایسا کرنا خود قرآنِ مجید ہی کے ارشاد کی تعمیل میں تھا۔ وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ایک سال تک زندہ رہے ——— زندہ کیا، یوں کہیے کہ صرف سانس لیتے رہے اور جس مہلک مرض کا وہ شکار ہو گئے تھے اُسے ایک راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں انہوں نے اندرونِ ملک کی تنظیم اور بیرونی خطرات کی مدافعت کے سلسلے میں جو کچھ کیا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر نحیف و نزار مریض شخص محض قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر کیا کچھ کر سکتا ہے۔ میں مختلف مکتبوں اور دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بڑی بڑی نامور ہستیوں سے شرفِ تلمذ اور تعارف حاصل رہا۔ میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی رہنماؤں کو بھی۔ لیکن مجھے پوری زندگی میں قائداعظمؒ سے بڑھ کر کوئی شخصیت متاثر نہ کر سکی۔ میں نے ہر ایک کو ان سے کمتر پایا ——— بلندیٔ کردار کے اعتبار سے بھی اور قرآنی بصیرت کے نہج سے بھی۔ اس قسم کے انسان صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کے خلاف آج ہذیان بک رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ چاند پر تھوکا، خود اپنے منہ پہ آیا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، سب مل کر بھی اس بطلِ جلیل کے غبارِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ اسے اپنے سحابِ کرم کے سائے میں رکھے۔

والسلام

خاکسار۔ غلام مرشد (سابق خطیب

بادشاہی مسجد لاہور ۱۹۳۵-۶۶ء) ۳ ۶/۲۶